معراج نسیم

(ہماری امی جان)

مرتبہ

پروفیسر جاوداں میر

معراج نسیم

(ہماری امی جان)

مرتب

پروفیسر جاوداں میر

ھمارا گھر

GAHWARA
C.B.45, Al-Falah Society
Shah Faisal Colony.Karachi-75230
Ph:4571322

کتاب کا نام	معراج نسیم (ہماری امی جان)
مرتب	پروفیسر جاوداں میر
نگراں	اَوجِ کمال
مطبع	ذکی اینڈ سنز کراچی
اشاعت اول	۲۰۰۳ء

زیر اہتمام
ماہنامہ دنیائے ادب کراچی
6th،623 فلور، ریگل ٹریڈ اسکوائر، ریگل چوک صدر کراچی ـ 74400 پاکستان
فون: 7761322

فہرست

○ حرفِ غم (مرتب)	پروفیسر جاوداں میر	۹
○ قطعہ تاریخ وفات	ڈاکٹر عروج اختر زیدی	۱۳
○ عجب اِک سانحہ سا ہوگیا ہے	خبریں (اخبارات سے ماخوذ)	۱۴
○ حق مغفرت کرے	(تعزیت نامے)	۲۱
○ میں اِک اکائی کی مانند ہر عدد میں ہوں	(خاندان)	۵۱
○ تصاویر		۵۷

ہم سفر

۱۔ میری اماں جان	پروفیسر جاوداں میر	۹۸
۲۔ جانے والے کبھی نہیں آتے	محمد انوارالدین صدیقی	۱۲۴
۳۔ میں کیا لکھوں؟	کمانڈر روشن خیال	۱۲۶
۴۔ امی سے ایک خواہش	ثمینہ روشن خیال	۱۲۸
۵۔ میری امی	پروفیسر فروزاں علی	۱۳۰
۶۔ میری شفیق خوشدامن	سید مسعود احمد رضوی	۱۳۸
۷۔ اِک ہوک سی دل میں اُٹھتی ہے	غزالاں حمایت	۱۴۳
۸۔ چچی جان	شفیق الزماں	۱۴۶

۹۔امی جی	اَوجِ کمال	۱۴۹
۱۰۔سایۂ شفقت	تسنیم کمال	۱۵۱
۱۱۔اے میری ماں	ذوالجمال	۱۵۴
۱۲۔میری ساس۔میری ماں	ڈاکٹر فرحین جمال	۱۵۶
۱۳۔نظمیں	ڈاکٹر بلند اقبال	۱۵۸
۱۴۔یا بی بی سیّدہ	ڈاکٹر بلند اقبال	۱۷۱
۱۵۔آنسوؤں کے ساتھ	ڈاکٹر بلند اقبال	۱۷۵
۱۶۔امی جان	شجیعہ اقبال	۱۷۷
۱۷۔میری ماں، میری آئیڈیل	ڈاکٹر زرافشاں سید	۱۸۱
۱۸۔Elegant Personality	ڈاکٹر وسیم خاں	۱۸۶

هم کاروان

۱۹۔بیگم حمایت علی شاعر (رباعیات)	راغب مرادآبادی	۱۸۸
۲۰۔سانحۂ جاں سوز (نظم)	قاضی رئیس	۱۹۱
۲۱۔کُلِ نفس ذائقته الموت	خواجہ معین الدین	۱۹۴
۲۲۔معراج بھابھی	یمین النساء معین	۱۹۵
۲۳۔آہ!	غلام دستگیر	۱۹۶
۲۴۔میری اچھی بھابھی	قمرالنساء	۱۹۷
۲۵۔بھابھی	بیگم قاضی شفیع الدین فرقت	۱۹۸

۲۶۔ جانی بیگم	خواجہ نصیرالدین	۱۹۹
۲۷۔ میری بھابھی	میر عنایت علی	۲۰۰
۲۸۔ آپا بیگم	منظور احمد	۲۰۴
۲۹۔ پیاری بھابھی	پروفیسر بیگم ممتاز مشہدی	۲۰۶
۳۰۔ جانی آپا	شاہینہ حسن	۲۰۹
۳۱۔ چچی جان	آذر نوید (جاوید)	۲۱۰
۳۲۔ امتی	بلقیس بانو شہزاد	۲۱۲
۳۳۔ او .... دور کے مسافر	رعنا اقبال	۲۱۳

ہم رشتگاں

۳۴۔ زندگی کیسی ہے پہیلی	ڈاکٹر عینی شگفتہ	۲۲۰
۳۵۔ بہت یاد آتی ہے	کرن الماس	۲۲۴
The Most Painful Days۔۳۶	ڈاکٹر فراز مسعود رضوی	۲۲۶
۳۷۔ زندگی بہت ظالم ہے	علی الدین (خرم)	۲۳۷
What Can Be Said۔۳۸	بینا مسعود رضوی	۲۳۹
My Dearest Grandma۔۳۹	ساحر شفیق	۲۴۵
The Most Precious Jewel۔۴۰	طلال روشن	۲۴۶
۴۱۔ ہمارے گھر کی روشنی	ثناء مسعود رضوی	۲۴۷
۴۲۔ ہمارا گہوارہ بکھر گیا	عدیل الدین	۲۴۹

۴۳۔میری امّی	آذر شفیق	۲۵۱
My Amanni۔۴۴	فریال روشن	۲۵۲
She Is In Hearts۔۴۵	فواز مسعود رضوی	۲۵۳

گوشۂ شاعر

۴۶۔نظمیں	حمایت علی شاعر	۲۵۷
۴۷۔خطوط	حمایت علی شاعر	۳۰۵

گوشۂ معراج

۴۸۔تعارف (عکس)	عنایت علی	۳۲۶
۴۹۔چند باتیں	پروفیسر جاوداں میر	۳۲۷
۵۰۔خالی میز (افسانہ)	معراج نسیم	۳۲۹
۵۱۔ٹوٹتے جالے (افسانہ)	معراج نسیم	۳۳۷
۵۲۔عکس (وجودِ زن سے ہے)	(چھوٹا سا سنسار... ایک خط)	۳۴۵
۵۳۔خط کا جواب (لتا دیوی کے نام)	معراج نسیم	۳۴۷
۵۴۔ایک تعارف (آنسہ سعادت رضوی)	معراج نسیم	۳۴۸
۵۵۔گھوڑوں کے جوتے (مضمون)	معراج نسیم	۳۴۹

پروفیسر جاوداں میر

حرفِ غم

قدرت بھی کتنی ستم ظریف ہے جس ماں کی گود میں زندگی کی پہلی سانس لی، جس کی آواز سن کر بولنا سیکھا اور جس کی انگلی پکڑ کر اپنے پیروں پر کھڑی ہوئی اور قدم قدم آگے بڑھی آج اپنی منزل پہ پہنچی ہوں تو پہلی کتاب اپنی ماں کے بارے میں "تعزیتی تحریروں" سے مرتب کر رہی ہوں ۔

اس ابر کو بھی اڑا لے گئی یہ تیز ہوا
جو میرے سر پہ رہا دستِ مہرباں کی طرح

یہ کتاب مرتب کرنے کا خیال بھی میرے سب سے چھوٹے بھائی بلند اقبال کو آیا۔ وہ ڈاکٹر ہے۔ اس نے اپنی ماں کو بچانے کی ہر وہ کوشش کر لی جو اس کے بس میں تھی مگر مشیت ایزدی کے آگے کس کی چلتی ہے۔ اسے اپنے ڈاکٹر ہونے پر غصہ آیا، اپنی بے چارگی پر روتا رہا اور ہم سب کو رلاتا رہا۔ وہ شاعر ہے نہ ادیب، مگر امی کے انتقال پر مسلسل لکھتا رہا۔ اشعار، نظمیں، نثری تاثرات ..... جو بھی اس کے لاشعور اور شعور میں تھا سبھی لکھ گیا۔ ایک دو ماہ اس کی یہی کیفیت رہی۔ وہ اپنی تحریریں کینیڈا سے ڈیڈی کو بھیجتا رہا۔ ڈیڈی بھی حیران تھے اور میں بھی .....

ماں سے کسے محبت نہیں ہوتی ۔ میں اور میرے سارے بھائی بہن اپنی ماں پر فدا رہے امی تھیں بھی ایسی ..... اُن سے جو بھی ملتا، اُن کا ہو جاتا۔ ہماری تو وہ آئیڈیل تھیں ۔ ہماری ہی نہیں ہمارے بچوں کی بھی آئیڈیل رہیں۔ بلند اقبال نے ڈیڈی سے جب یہ کہا کہ امی پر ایک

کتاب مرتب ہونی چاہیے تو ہم سب کی آنکھیں روشن ہوگئیں۔ اس نے کہا میں امی کو زندہ رکھنا چاہتا ہوں، زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ ہم میں سے کسی نے نہ سوچا تھا کہ زندگی یوں بھی ہوتی ہے، آدمی اپنی تخلیقات یا ان تحریروں میں بھی زندہ رہتا ہے جو اس کے چاہنے والے لکھتے ہیں۔ ڈیڈی کو بھی یہ خیال نہیں آیا تھا۔ وہ امی کی زندگی میں یہ ضرور سوچتے تھے کہ ہمارے خاندان کے ان تمام لوگوں کی تحریریں یکجا کر دی جائیں جنہیں لکھنے کا شوق رہا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے بچوں کی طالب علمی کے زمانے کی تحریریں بھی جمع کرنا شروع کر دی تھیں، ان بزرگوں کی بھی جو اللہ کو پیارے ہو گئے اور ان کے مسودے کہیں بکھرے ہوئے ہیں۔ خود امی جان کے افسانے اور مضامین بھی یکجا نہیں تھے جو پچاس اور ساٹھ کی دہائی میں انڈیا اور پاکستان کے مختلف رسائل میں چھپتے رہے۔

ابھی ڈیڈی اس کتاب کے بارے میں مواد جمع کر ہی رہے تھے کہ میرے چچا میر عنایت علی جو اورنگ آباد (انڈیا) میں ڈویژنل انجینئر تھے، اپنی ملازمت سے ریٹائر ہو گئے اور انہوں نے ایک کتاب مرتب کر دی ..... ''مٹی مرے دیار کی'' مرہٹواڑہ کے اردو افسانے کی ایک انتھالوجی ..... عنایت (شبیر) چچا نے سابق ریاست حیدر آباد دکن کے ایک صوبے مرہٹواڑہ کے مختلف شہروں میں آباد، مختلف افسانہ نگاروں کے منتخب افسانے جمع کر کے اپنے ایک مقالے کے ساتھ ۲۰۰۱ء میں شائع کر دیئے۔

ڈیڈی نے ۱۹۷۸ء میں یہاں ایک ادارہ ''المصنفین'' کے نام سے قائم کیا تھا جس کے زیر اہتمام ان کی پانچ کتابیں شائع ہوئی تھیں۔

۱۔ شیخ ایاز (شخص و شاعر) سندھی کے عہد آفریں شاعر کا مطالعہ۔ ۱۹۷۸ء

۲۔ شخص و عکس (مضامین و مباحث کا ضخیم مجموعہ) ۱۹۸۴ء

۳۔ ہارون کی آواز (چوتھا شعری مجموعہ) ۱۹۸۵ء

۴۔ Flower in Flames

(امن عالم کے موضوع پر ڈیڈی کی طویل افسانوی نظم "بنگال سے کوریا تک" کا انگریزی ترجمہ)

مترجم، پروفیسر راجندر سنگھ روما۔ پنجابی یونیورسٹی، پٹیالہ (انڈیا) ۱۹۸۵ء

۵۔ حرف حرف روشنی

(منتخب کلام کا دوسرا ایڈیشن) ۱۹۸۹ء (پہلا ایڈیشن مکتبہ جامعہ دہلی نے ۱۹۸۶ء میں شائع کیا تھا)

پھر انہوں نے اپنا ادارہ "المصنفین" مالی مشکلات کے سبب بند کر دیا گیا۔ البتہ عنایت چچا نے اسے ہندوستان میں زندہ کر دیا۔ "مٹی مرے دیار کی" "المصنفین" اورنگ آباد کے زیر اہتمام شائع ہوئی جس میں دوسروں کے ساتھ ہمارے گھرانے کے اہل قلم سکندر علی وجد، قاضی شفیع، حمایت علی شاعر، غوث ساجد، عباس انجم، جاوید ناصر، سید نورالحسنین اور میر مجاہد علی کے علاوہ میری امی معراج نسیم کا افسانہ بھی شامل ہے۔ اس کے بعد عنایت چچا نے دوسری کتاب "بیادِ وجد" شائع کی اور یہ سلسلہ جاری ہے۔

ان کتابوں کی اشاعت میں ابا جان کی اعانت بھی شامل رہی۔ انہیں خوشی تھی کہ جو کام وہ نہ کر سکے ان کا چھوٹا بھائی کر رہا ہے۔ عنایت چچا ابا جان کی کتابیں بھی شائع کرنے کا پروگرام رکھتے ہیں جن میں مجلّہ "شخصیت" کا "حمایت علی شاعر نمبر" منظوم خود نوشت سوانح حیات "آئینہ در آئینہ" اور سات سو سالہ نعتیہ شاعری کا انتخاب "عقیدت کا سفر" سرِ فہرست ہیں۔

ہماری امی جان، جو ہمارے دادا سید تراب علی صاحب کی سب سے بڑی بہو ہونے کے ناطے ہمارے خاندان کی "خاتونِ اول" ہونے کا اعزاز رکھتی ہیں، کئی خصوصیات کی بنا پر اہم ترین خاتون تھیں۔ وہ اس کتاب کی اشاعت کا حق رکھتی تھیں۔ وہ بحیثیت افسانہ نگار بچوں کی ادیبہ، خاتون صحافی اور ایک باشعور قلم کار تھیں۔ اس کے علاوہ خاتون خانہ کی حیثیت سے بھی جو کئی رشتوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ امی ایک مثالی خاتون تھیں۔ ان کے انتقال کے بعد دنیا بھر کے

اخبارات میں جو خبریں شائع ہوئیں، ٹیلی فون پر اور تحریری طور پر جو تعزیتی بیانات ڈیڈی اور گھر کے دوسرے افراد کو ملے، بے شمار ہیں۔کوئی مشہور شخصیت ایسی نہیں جو ہمارے غم میں شریک نہ ہوئی ہو، ابا جان کے بیشتر دوستوں کی بیگمات بھی امی کو بے حد چاہتی تھیں۔سبھی نے ان کا غم منایا۔دنیا کے ہر اس شہر میں جہاں ڈیڈی کے دوست اور ہمارے عزیز ہیں۔امی کے لئے قرآن خوانی ہوئی اور ان کی مغفرت کے لئے دعائیں مانگی گئیں۔اتنی محبت کسے نصیب ہوتی ہے۔میں اس کتاب میں ان سب محبت کرنے والوں کے نام تو نہیں لکھ سکتی مگر سب کی شکر گزار ہوں کہ سب نے ہمیں بہت نوازا۔ڈیڈی کے بعض دوست نیویارک اور شکاگو سے بھی نماز جنازہ میں شرکت کے لئے ٹورنٹو پہنچے۔میں ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی اور ان کی بیگم کی بطور خاص ممنون ہوں کہ وہ ہر مرحلے میں ڈیڈی کے شریک غم رہے۔

کراچی میں میرے چھوٹے بھائی روشن خیال اور اوج کمال نے اپنے عزیزوں، دوستوں اور رشتہ داروں کے ساتھ امی جان کا غم جس انداز میں منایا وہ اپنی مثال آپ ہے۔مگر یوں لگتا تھا جیسے سب کچھ یہیں ہوا ہے۔میرے شوہر، خبر ملتے ہی سعودی عرب سے آ گئے۔ڈیڈی کے کتنے ہی دوست سوئم میں شرکت کے لئے حیدر آباد اور دوسرے شہروں سے آئے۔میں اس گھر کی بڑی بیٹی ہونے کے ناتے سب کی ممنون ہوں۔اس کتاب کی اشاعت میں میرے چھوٹے بھائی اوج کمال نے بھی بہت ہاتھ بٹایا ہے اس کی اعانت ہر مرحلے میں میرے ساتھ رہی۔میں اس کا کیا شکریہ ادا کروں کہ وہ بھی ماں کا دیوانہ ہے۔ہر کام اس نے فرض سمجھ کر پورا کیا ہے۔خاندان کے سبھی لوگوں کے تاثرات اس کتاب میں ہیں۔ہمارے خاندان کی پہلی کتاب ہے جس میں بچے، جوان، بوڑھے سبھی شریک ہیں۔سب کے دلوں میں امی کا غم تازہ ہے۔سبھی کی تحریروں میں ''ہماری امی جان'' زندہ ہیں .... اللہ تعالیٰ سب کی دعائیں قبول کرے اور ہماری امی کو ہمیشہ اپنے سایہ رحمت میں رکھے، آمین ثمہ آمین۔

ڈاکٹرعروج اختر زیدی
(ونڈسر۔کینیڈا)

معراجِ نسیم
(قطعۂ تاریخ وفات)

دارِ ظلمت سے گئیں نورِ مبیں کی جانب
اب نہ دیکھیں گی کبھی مڑ کے زمیں کی جانب
اب کہاں دائرۂ تیرگیِ وہم و گماں
اب ہیں وہ محوِ سفر مہرِ یقیں کی جانب
چھوڑ کر جنت شاعر کو گئیں بہرِ نیاز
والد و والدۂ خُلد نشیں کی جانب
تنِ بے جاں ہوا آسودۂ خاکِ ''سپرنگ''
روحِ معراج گئی عرشِ بریں کی جانب

۱۴۲۳ھ

(مطبوعہ''اردو ٹائمز''ٹورانٹو۔کینیڈا۔۲۸/نومبر۲۰۰۲ء)

عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

(خبریں ..... اخبارات سے ماخوذ)

حمایت علی شاعر کی بیگم ٹورانٹو میں انتقال کر گئیں

ٹورانٹو میں سپردِ خاک کر دیا گیا، جنازے میں ادبی شخصیات کی بڑی تعداد نے شرکت کی

ٹورانٹو (نمائندہ خصوصی) حمایت علی شاعر کی بیگم معراج نسیم ٹورانٹو میں انتقال کر گئیں۔ نماز جنازہ مدینہ مسجد میں ادا کی گئی جس میں سینکڑوں افراد نے شرکت کی۔ مرحومہ کو پکرنگ کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ انتقال کے وقت مرحومہ کی عمر 66 برس تھی۔ مرحومہ کافی عرصے سے شوگر کے مرض میں مبتلا تھیں اور انتقال سے ایک ماہ قبل کراچی کے آغا خان ہسپتال کے ڈاکٹروں نے جگر میں کینسر کا خدشہ ظاہر کیا تھا مرحومہ معراج نسیم کا علاج امریکہ اور کینیڈا کے ہسپتالوں میں کرایا گیا لیکن مرض میں کوئی افاقہ نہ ہوا مرحومہ معراج نسیم نہایت نیک دل ہمدرد، بردبار اور مشفق خاتون تھیں۔ ٹورانٹو میں مقیم حمایت علی شاعر کے داماد سید مسعود احمد رضوی اور صاحبزادی فروزاں علی کی قیام گاہ پر مرحومہ کا سوئم ہوا جس میں کئی معروف ادبی شخصیات نے شرکت کی امریکہ سے ڈاکٹر زرافشاں سید، ڈاکٹر وسیم خان، افسانہ نگار ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی، بلقیس فاروقی، ٹورانٹو سے ذوالجمال، ڈاکٹر فرحین، ڈاکٹر بلند اقبال، نجمہ اقبال، اطہر رضوی، نسیم سید، بشیر خان، سید افتخار حیدر، لطافت صدیقی، رحیم انجان، ڈاکٹر تقی عابدی، شان الحق حقی اور اشفاق حسین کے علاوہ دیگر معروف شخصیات نے نماز جنازہ میں شرکت کی اور حمایت علی شاعر سے اظہار

تعزیت کیا۔ واضح رہے کہ حمایت علی شاعر چار نومبر کو اپنی بیگم کے ہمراہ ٹورانٹو پہنچے تھے۔ نمائندہ اردو ٹائمز سے باتیں کرتے ہوئے حمایت علی شاعر نے کہا کہ ان کے دو بیٹے کمانڈر روشن خیال اور پروفیسر اوج کمال کے علاوہ دو بیٹیاں پروفیسر جاوداں میر اور پروفیسر فروزاں حمایت کراچی میں ہیں جو بروقت اپنی والدہ کی آخری رسومات میں شرکت کے لئے ٹورانٹو نہیں پہنچ سکیں۔ مشہور شاعرہ ڈاکٹر عروج اختر زیدی نے قطعہ تاریخ وفات اس طرح پیش کی ہے۔

دار ظلمت سے گئیں نور مبیں کی جانب
تنِ بے جاں ہوا آسودۂ خاکِ یکرنگ
اب نہ دیکھیں گی کبھی مڑ کے زمیں کی جانب
روحِ معراج گئی عرشِ بریں کی جانب

۱۴۲۳ھ

ادارہ ''اردو ٹائمز'' معراج نسیم کے انتقال پرملال پر حمایت علی شاعر اور ان کے احباب سے دلی اظہار تعزیت پیش کرتا ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل کی توفیق دے۔ (آمین)

روزنامہ جنگ کراچی ہفتہ 23 نومبر 2002ء

حمایت علی شاعر کی اہلیہ انتقال کر گئیں

کراچی (اسٹاف رپورٹر) ممتاز شاعر حمایت علی شاعر کی اہلیہ کمانڈر روشن خیال اور اوج کمال کی والدہ سیدہ معراج نسیم کینیڈا (ٹورنٹو) میں جمعہ کی صبح مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئیں۔ ان کی عمر 65 سال تھی۔ وہ جگر کے عارضے میں مبتلا تھیں۔ واضح رہے کہ حمایت علی شاعر بھی گزشتہ ایک ماہ سے کینیڈا میں مقیم ہیں۔ مرحومہ کا سوئم اتوار 24 نومبر کو بعد نماز ظہر جامع مسجد تاج سینٹر شاہ فیصل کالونی نمبر 1 میں ہوگا۔ خواتین کیلئے قرآن خوانی کا انتظام C/B-45 الفلاح سوسائٹی، شاہ فیصل کالونی نمبر 1 میں کیا گیا ہے۔ دریں اثناء آئی ایس پی آر کے ڈائریکٹر جنرل میجر جنرل راشد قریشی، ڈائریکٹر آئی ایس پی آر بریگیڈیئر صولت رضا اور کراچی میں آئی ایس پی آر کے ترجمان لیفٹیننٹ کرنل [illegible] ملک نے کمانڈر روشن خیال کی والدہ کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے مرحومہ کیلئے دعائے مغفرت کی اور پسماندگان کیلئے صبر جمیل کی دعا کی۔

کمانڈر روشن خیال کی والدہ کے انتقال پر پاسبان کا اظہار تعزیت

کراچی (پ ر) پاسبان کراچی کے صدر طارق [illegible] کمانڈر روشن خیال کی والدہ اور حمایت علی شاعر کی اہلیہ کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔

Daily DAWN Karachi

Himayat Ali Shair's wife passes away

KARACHI, Nov 22: Wife of poet Himayat Ali Shair died in Canada on Friday. She will be buried in Canada, family sources said.

She was also the mother of Commander Roshan Khayal of the ISPR (Navy), Karachi, and Auj-i-Kamal, the editor of Duniya-i-Adab, a literary magazine.

She had gone to Toronto for treatment of a liver disease where her two sons live.

Soyem will be held here on Sunday after Zuhr prayers in Jamia Masjid, Taj Centre, Shah Faisal Colony.

Arrangements for ladies have been made at her residence: C-B 45, Al-Falah Society, Shah Faisal Colony. — APP

بین الاقوامی شہرت یافتہ شاعر حمایت علی شاعر کی اہلیہ انتقال کر گئیں

مرحومہ کی تدفین کینیڈا کے قبرستان میں کی گئی، فاتحہ سوئم بعد نماز ظہر اتوار کو منعقد ہوگی

کراچی (اسٹاف رپورٹر) بین الاقوامی شہرت یافتہ پاکستانی شاعر، نقاد اور افسانہ نگار حمایت علی شاعر کی اہلیہ اور پاکستان نیوی کے کمانڈر روشن خیال اور دنیائے ادب کے مدیر اوج کمال کی والدہ گزشتہ روز علالت کے باعث انتقال کر گئیں۔ مرحومہ کی تدفین کینیڈا کے قبرستان میں کی گئی۔ دریں اثناء پاکستان میں ان کی رہائش گاہ واقع شاہ فیصل کالونی میں ان کی روح کو ایصال ثواب کیلئے فاتحہ خوانی کی گئی۔ مرحومہ کی فاتحہ سوئم اتوار کو بعد نماز ظہر CB-45 شاہ فیصل کالونی میں منعقد ہوگی جبکہ مرد حضرات کیلئے علاقائی مسجد واٹر اینڈ سیوریج بورڈ شاہ فیصل ٹاؤن میں فاتحہ کا اہتمام کیا گیا ہے۔

روزنامہ جرأت کراچی

روزنامہ کائنات کراچی ہفتہ 23 نومبر

حمایت علی شاعر کی اہلیہ انتقال کر گئیں

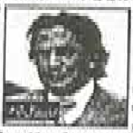

[illegible]

حمایت علی شاعر کی اہلیہ کینیڈا میں وفات پا گئیں

[illegible]

روزنامہ خبریں کراچی 23 نومبر 2002ء

روزنامہ جنگ کراچی اتوار 24 نومبر 2002ء

حمایت علی شاعر کی اہلیہ کے انتقال پر گورنر اور شعراء کا اظہار تعزیت

کراچی (اسٹاف رپورٹر) گورنر سندھ محمد میاں سومرو نے حمایت علی شاعر کی اہلیہ کے انتقال پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے مرحومہ کی مغفرت اور لواحقین کیلئے صبر جمیل کی دعا کی۔ ادارہ روح ادب پاکستان کے سرپرست اعلیٰ شیخ مظفر عالم، ایس ایچ ہاشمی، [illegible] سید مظہر احمد مدنی، [illegible] مجلس منتظمہ کے اراکین سیف الرحمٰن گرامی، پروفیسر سحر انصاری، پروفیسر آفاق صدیقی، ڈاکٹر ظفر اقبال، پروفیسر ریاض صدیقی، پروفیسر جاذب قریشی، پروفیسر انیس زیدی، اختر سعیدی، راشد نور، رضوان احمد صدیقی، انجم خان، خالد معین، مظہر ہانی، انجم جاوید، [illegible] ڈاکٹر آصف فانی، [illegible] حجاب عباسی، [illegible] نے ممتاز شاعر حمایت علی شاعر کی اہلیہ کے انتقال پر اظہار تعزیت کیا ہے۔

روزنامہ جسارت کراچی 8 25 نومبر 2002

کمانڈر روشن خیال کی والدہ کے سوئم میں ممتاز شخصیات کی شرکت

گورنر سندھ اور گورنر اسٹیٹ بینک کی سوگوار خاندان سے تعزیت

کراچی (اسٹاف رپورٹر) حمایت علی شاعر کی اہلیہ [illegible] کے فرزند کمانڈر روشن خیال اور اوج کمال کی والدہ کے سوئم کے سلسلے میں قرآن خوانی گزشتہ روز ان کی رہائش گاہ پر منعقد ہوئی جس میں جمیل الدین عالی، [illegible] ڈاکٹر پیرزادہ قاسم، غازی صلاح الدین، یوسف خان، سرشار صدیقی، [illegible] شیخ مظفر عالم، [illegible] سیف الرحمٰن گرامی، رضوان صدیقی، پروفیسر سحر انصاری، کرنل (ر) اشفاق حسین، [illegible] سعادت جعفری، [illegible] شہاب الدین شہاب، [illegible] شاکر جعفری، شہناز صدیقی، [illegible] راشد نور، [illegible] مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی ممتاز شخصیات نے شرکت کی۔ دریں اثناء گورنر سندھ محمد میاں سومرو اور گورنر اسٹیٹ بینک ڈاکٹر عشرت حسین نے حمایت علی شاعر اور کمانڈر روشن خیال سے تعزیت کی ہے۔

میں کئی خطوط میں میں نے احساسات کا اظہار کیا تھا وہ خطوط آپ کو نہیں ملے۔ آپ یہی سوچ رہے ہوں گے کہ میں بے حس ہوں۔ بھائی میں اس وقت بھی رنجیدہ ہوں اور بار بار تصور میں لاتا ہوں کہ تمہاری تنہائی کس بلا کی ہوگی۔

انسانی زندگی حادثات پر مبنی ہے میں گذشتہ سات ماہ سے فالج کا شکار ہوں۔ بستر پر ہوں، علاج جاری ہے، پُر امید بھی ہوں۔ اتنا تو ہوا ہے کہ تھوڑی دیر ضروری یادداشتیں لکھ لیتا ہوں جب تک جسم ساتھ دیتا ہے پڑھ بھی لیتا ہوں۔ آہستہ آہستہ اس زندگی کا عادی ہو رہا ہوں لیکن جی تو اب بھی گھبراتا ہے۔ جی ہزار چاہتا ہے جو کچھ ذہن میں ہے کم از کم اسے تو لکھ ہی لوں۔

ناطق بدایونی (کراچی)   ۲۰۰۲/۱۲/۱ء

برادرم حمایت علی شاعر

تمہاری اہلیہ کے انتقال کی خبر مجھے خسرو کی زبانی ملی۔ سن کر بہت افسوس ہوا، اللہ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور تمہیں اور سب اولادوں کو صبر عطا فرمائے (آمین ثمہ آمین)

میری عمر اب ۹۲ سال سے زیادہ ہوگئی ہے ہاتھ میں رعشہ ہے ٹھیک سے بول بھی نہیں سکتا، چلنا پھرنا بھی مشکل ہے ورنہ میں خود تمہارے پاس آتا۔

یہ چند سطریں بھی خسرو سے لکھوا رہا ہوں۔ اُمید ہے خیال نہیں کرو گے۔ رفیقہ حیات کی جدائی کا غم بہت ہوتا ہے۔ میں صرف دعا کرسکتا ہوں اللہ صبر دے۔ آمین

پروفیسر عنایت علی خاں (حیدرآباد)   ۲۲/نومبر ۲۰۰۲ء

محترم حمایت صاحب!

اخبار سے آپ کی شریک حیات کے سانحہ ارتحال کا علم ہوا۔ بے شک ہم سب اللہ کے

بندے ہیں اور سب کو واپس اسی کے پاس جانا ہے یعنی موت ایک نا قابلِ تردید حقیقت ہے لیکن شریک حیات جیسی ہستی کی مفارقت کا صدمہ بھی فطری امر ہے۔ ایک طویل عرصے کی موانست کا یک لخت ختم ہو جانا اور ایسے ساتھی کا بچھڑ جانا جسے قرآن میں ''ھُن لباس الکم'' (وہ تمہارے لئے بہ منزل لباس کے ہیں) کہا گیا۔ غم واندہ اور محرومی کا سبب ہونا ہی ہوتا ہے بہر حال بقول شاعر۔

موت سے کس کو رستگاری ہے　　　آج وہ کل ہماری باری ہے

معاملہ صرف آگے پیچھے کا ہے۔ پھر قدرت نے انسان کو کچھ ایسی صلاحیت سے نوازا ہے کہ رفتہ رفتہ ہی سہی، دل کو قرار آ ہی جاتا ہے۔

منصور عاقل (سہ ماہی ''الاقربا'' اسلام آباد)　　　۲۷/ جنوری ۲۰۰۳ء

برادرم محترم حمایت صاحب

گزشتہ دنوں اخبارات کے ذریعہ یہ روح فرسا خبر پڑھی کہ آپ کی اہلیہ محترمہ کینیڈا میں انتقال فرما گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور آپ کو نیز دیگر پس ماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین

خبر سے یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ آپ کینیڈا جا چکے ہیں اور آپ کا بیرون ملک کا پتہ معلوم نہ ہونے کے سبب بروقت تعزیت نہ کرنے سے قاصر رہا۔ بہر حال مجھے آپ کے اس صدمے کا بڑی حد تک اندازہ ہے۔ یہ ایک کبھی نہ پر ہونے والا خلا ہے لیکن اللہ تعالیٰ ہی انسان کو صبر عطا فرماتا ہے۔ آپ کے واپسی پروگرام کا مجھے کوئی اندازہ نہیں۔ اس لئے یہ خط آپ کے کراچی والے پتہ پر ہی بھیجا جا رہا ہے۔ سہ ماہی الاقربا کا تازہ شمارہ بھی بھجوایا جا چکا ہے۔ امید ہے یہ ترسیلات آپ کو وطن واپسی پر مل جائیں گی، میں ممنون ہوں گا اگر آپ اپنی واپسی سے مجھے مطلع فرما دیں۔

میرے محترم رفیق کار جناب محمود اختر سعید صاحب بھی آپ کی اہلیہ کے حادثہ جانکاہ پر

ان کی مغفرت کے لئے اور آپ کے نیز دیگر اعزاء کے صبر جمیل کے لئے دعا گو ہیں۔

ڈاکٹر سید منظر حسن (حیدر آباد، سندھ)   ۳۱/ مئی ۲۰۰۳ء

برادرم حمایت علی شاعر صاحب

آپ کا بغیر تاریخ کا خط آپ کی بیگم کے انتقال سے متعلق پڑھا۔ آپ خوش قسمت تھے کہ آپ کو ایسی بیوی ملیں اور مرحومہ خوش قسمت تھیں کہ انہیں آپ جیسا محبت کرنے والا، محبت کو سمجھنے والا شوہر ملا۔

خدا مرحومہ کی مغفرت فرمائے اور آپ کو اور بچوں کو صبر عطا فرمائے جس کی ضرورت ہم سب کو زندگی کے ہر لمحے میں رہتی ہے۔

نظم ''تمہارے بعد'' دل میں اتر جانے والی نظم ہے۔ ہم دونوں بہت متاثر ہوئے، طاہرہ کی بھابھی کا انتقال دماغ کے کینسر سے چند ماہ پہلے ہوا تھا۔ ان کے شوہر سید حسن مسعود شاید آپ کے کالج فیلو تھے آپ کراچی میں مقیم ہیں۔ طاہرہ دونوں چیزیں انہیں بھیج رہی ہیں وہ ابھی تک صدمے سے نکل نہیں پائے ہیں۔ آپ کے خط اور آپ کی نظم میں انہیں اپنے ہی جذبات ملیں گے

سلطان جمیل نسیم (کراچی)   ۲۴/ نومبر ۲۰۰۲ء

حمایت بھائی

میں کینیڈا سے آیا تو معلوم ہوا آپ وہاں پہنچ گئے ہیں لیکن آج ۲۴/ نومبر ۲۰۰۲ء کے اخبار سے معلوم ہوا کہ آپ کی شریک حیات، بھابھی معراج نسیم، ہمیشہ کے لئے آپ کو تنہا چھوڑ گئیں۔ میں اس کو سانحہ، حادثہ، المیہ اور اسی قبل کے الفاظ سے منسوب نہیں کروں گا۔ اسے مشیت الٰہی، تقدیر کا لکھا کہوں گا اور آپ کے لئے صبر کی، بچوں کے لئے برداشت کی اور مرحومہ کے لئے

مغفرت کی دعا کروں گا۔ اگر چہ ان الفاظ سے صبر نہیں آتا ہے مگر صبر کے سوا چارہ بھی کیا۔ مرحومہ کی سب سے بڑی نشانی ان کی صاحبِ حیثیت، تعلیم یافتہ، مہذب سعادت مند اولاد بڑا ورثہ ہے۔ اللہ اس ورثے کو سلامت رکھے اور آپ کا مکمل دھیان رکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

مقصود الٰہی شیخ (بریڈفورڈ۔ برطانیہ) ۲۰۰۲/۱۲/۳ء

محترمی حمایت صاحب

آج نکہت بریلوی صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ بیگم حمایت صاحبہ کا ٹورنٹو میں مختصر علالت کے بعد انتقال ہو گیا۔ خدا مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس میں ان کو اعلیٰ درجہ عنایت فرمائے۔ آمین

دعا ہے کہ خدا آپ کو یہ صدمہ برداشت کرنے کی ہمت دے اور صبر عطا فرمائے۔ آمین

عمر کے اس موڑ پر یہ دائمی جدائی بڑی جانسوز اور بے حال کر دینے والی ہے لیکن مشیت ایزدی کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ میرے چند کلمات سے آپ کو کیا ڈھارس ہو گی مگر رسم دنیا کے علاوہ مجھے آپ سے ایک گونہ خلوص ہے لہذا آپ کے غم میں شرکت کرتے ہوئے یقین دلاتا ہوں کہ آپ کے اس نقصان عظیم کا بڑی حد تک احساس ہے۔ دعا ہی کر سکتا ہوں سو دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت دے۔ آپ کی طرف آپ کے پورے خاندان کی نظریں ہوں گی لہذا سب کی تسلی و دلاسہ کے لئے صبر و استقلال سے کام لیجئے اور اپنے چھوٹوں کو حوصلہ دیجئے کہ یہ غم ہر لحاظ سے ان سب کے لئے کوہ گراں ہے۔ وہ ماں ایسی ہستی سے محروم ہوئے ہیں وہ سبھی انتہائی غم کی حالت میں ہیں۔ خدا ہم سب پر اپنا رحم و کرم فرمائے۔ آمین

کتاب آخری وقت میں طباعت کی غلطیوں کی وجہ سے تاخیر سے شائع ہو رہی ہے انشاء اللہ بھجوا دوں گا، میری کتاب ایک طرح سے آپ سے مستعار دو ہوں سے ہی شروع ہو رہی ہے۔ وجہ خط لکھنے کی یہ تھی۔ واپسی کی خبر سنی تو عریضے کے ذریعے ضمنی طور یہ بات بھی لکھ دی ہے۔

بچوں کو بھی سلام اور دعائیں اور آپ کے گھر پر اپنی رحمتوں کا سایہ رکھے۔

اکبر حیدر آبادی (آکسفورڈ۔ برطانیہ) ۲۷/ مئی/ ۲۰۰۲ء

برادر عزیز و محترم حمایت

مجھے آپ کی اہلیہ کی رحلت کی اندوہناک خبر سن کر دلی صدمہ ہوا۔ یہ مختصر سا خط ایک شوہر کی خدمت میں بیوی کا اور ایک بیٹے (اوج) کی ماں کا پرسہ ہے اور بس!

خداوند کریم آپ دونوں کو اس عظیم سانحے کو برداشت کرنے کا حوصلہ عطا کرے اور مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ رحمت فرمائے۔ آمین

یوسف ناظم (بمبئی) ۱۲/ جولائی ۲۰۰۲ء

برادرم حمایت علی شاعر

اورنگ آباد سے آپ کے چھوٹے بھائی میر عنایت علی نے فوراً ہی اس جانکاہ سانحے کی اطلاع مجھے دی تھی اور کینیڈا کا فون نمبر بھی لکھوا دیا تھا۔ میں نے دو مرتبہ فون پر کچھ کہنے کے ارادے سے فون ملایا لیکن لائن نہیں ملی۔ مل بھی جاتی تو میں آپ سے کہتا کیا۔ تسلی کے شاید دو لفظ بھی میری زبان سے نہ نکل پاتے۔ آپ کو میں خط بھی نہ لکھ سکا اور اب بھی بس ٹیڑھے میڑھے الفاظ لکھ رہا ہوں یہ تو عمر بھر کا غم ہے۔ نصف صدی کی دلنواز معیت یوں ختم ہو جائے گی آپ کو کیا، کسی کو بھی پتہ نہیں تھا۔ سبھی جگہ صف ماتم بچھ گئی۔ خود عنایت علی کے گھر میں اہل خانہ کی سانس کی آمد و شد تک

مسئلہ بن گئی تھی۔ عنایت علی بھی بڑی مشکل سے سنبھل پائے۔ آپ کو مسلسل پڑھتا رہتا ہوں ''سب رس'' میں مغنی تبسم کے نام آپ کے مکتوب نے تو دہلا دیا۔ شاعری نظم بھی پڑھی۔ اب یہی یاد آپ کی حرز جاں ہے۔ دعا کرتا ہوں کہ آپ صحت مند رہیں اور اپنے بچوں کے ساتھ شب و روز گزاریں۔ میں آپ کو کیا تسلی دوں۔ حالات شاید بہتر ہو رہے ہیں۔ پتہ نہیں آپ اورنگ آباد جائیں گے یا نہیں۔ میں تین سال سے باہر نہیں گیا۔ حتیٰ کہ اپنی پوتی کی شادی کی تقریب میں حیدر آباد نہیں جا سکا۔ بچوں کو دعائیں۔ عائشہ بھی آپ کو آداب اور دعائیں کہتی ہیں۔

سید محمد حبیب اللہ اوج (لاہور) ۱۹/ جون ۲۰۰۳ء

برادر محترم حمایت علی شاعر

آپ کا دیرینہ نیاز مند اور ہم وطن آپ سے مخاطب ہے برادرم الحاج منصور عاقل صاحب کے موقر سہ ماہی ''الاقربا'' میں آپ کی رفیقۂ حیات کی آپ سے دائمی جدائی کی المناک خبر پڑھ کر شدت غم سے آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ ایک طویل عرصہ تک رفاقت اور غم والم، رنج و راحت میں باہمی شمولیت کے بعد تاابد جدائی کے المیے کا احساس صرف ان ہی افراد کو ہو سکتا ہے جن پر ایسی قیامت ٹوٹ پڑی ہو۔

حمایت بھیا میں بھی ان غمزدہ افراد میں شامل ہوں جن پر فلک کج رفتار نے غم واندوہ کے مصائب توڑے۔ میری رفیقۂ حیات پر Breast Cancer کا حملہ ہوا اور متعلقہ سرجن نے نصف سے زائد Breast کاٹ کر پھینک دیا۔ میری رفیقۂ حیات اب تاعمر Cancer کی ادویہ پر گزارہ کر رہی ہیں جو بہت گراں ہیں۔ راقم پر ایک کوہ گراں اس وقت ٹوٹ پڑا جب راقم کی ایک پابند صوم وصلوٰۃ لائق و فائق صاحبزادی، یہ حدیث سن کر کہ علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین جیسے دور دراز ملک کا سفر کرنا ہی کیوں نہ لاحق ہو، پہلے چینی زبان کی تحصیل کی پھر ایک اسکالرشپ پر

بیجنگ جا کر وہاں کی Dormitory میں چار برس گزارے۔ واپسی پر شنگھائی میں مسجد عمرو بن عاص میں چینی مسلم طالبات کی جمعہ کی نماز کی امامت کی۔ وہاں کے پیش امام کو اُس وقت کے وزیر اعظم ،صدر ضیا کے P.S اور میرے دوست ''میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا'' اور دیگر کتب کے مصنف ومولف صدیق سالک مرحوم کے توسط سے مجھ سے تاج کمپنی کا مطبوعہ خوبصورت فرقان حمید اور 30 سپارے طلب فرمائے، اور وہاں کے پیش امام کو (جو کسی دور کا قرآن پاک کا ایک پھٹا صفحہ پورے احتیاط سے پڑھا کرتے تھے) انہیں تاج کمپنی کا مطبوعہ کلام مجید کیا دیا انہیں حقیقی معنی میں دو جہاں کی نعمت مل گئی۔ 30 پارے مسلم طالبات میں یہ کہہ کر تقسیم کئے کہ آپس میں تبادلہ کرلیا کریں۔ واپسی میں منگولیا، ٹوکیو، ہانگ کانگ، تھائی لینڈ وغیرہ میں اسلامی تعلیمات کی تبلیغ کرتی رہی۔ واپس آنے پر ایک ایسی ویگن میں سوار ہوئیں جن میں نائجیریا کی کالی یرقان زدہ خواتین تھیں۔ یہ چھوت کی بیماری تھی۔ آخر وقت میں ہم نے اسے میٹرو ہسپتال کے کینسر وارڈ میں داخل کرایا تو متعلقہ ڈاکٹروں نے کہا آپ لوگوں نے بڑی تاخیر کر دی۔

زہر غم کر چکا ہے اپنا کام

بالآخر 5 جنوری م 8 شوال المکرم کو ٹھیک 5 بجے اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی

اناللہ وانا الیہ راجعون

مرحومہ کی بڑی خواہش تھی کہ آخری سانسیں مدینہ میں لی جائیں مگر قدرت کو یہ منظور تھا کہ وہ جنت الفردوس میں جگہ پائے۔

میری سب سے چھوٹی بٹیا نے جو ڈاکٹر ہے اپنی تمام جمع پونجی اپنی بڑی بہن کی تجہیز و تکفین پر لگا دی اور ''نوائے وقت'' کے اسٹاف رپورٹر الحاج اختر علی شاہ کو کثیر رقم دے کر حج بدل کروایا۔ آپ سے مودبانہ درخواست ہے کہ آپ بھی میری مرحومہ بٹیا کہ نام اس کا فرخندہ تھا اس کی مغفرت کے لئے دعا فرمائیں۔ زحمت کے لئے پیشگی شکریہ۔

ڈاکٹر فہیم اعظمی (مدیر، ماہنامہ ''صریر'' کراچی) ۲۷/نومبر ۲۰۰۲ء

بھائی حمایت علی شاعر

آپ کی زوجہ مرحومہ کی وفات کی خبر سن کر افسوس ہوا۔ میں اس سانحہ سے گزر چکا ہوں اس لئے اس جذباتی اور غیر منطقی لگاؤ سے واقف ہوں جو آخر دم تک بلکہ اس کے بعد بھی زوجہ سے ہوتا ہے۔ میں حاضر ہونے والا تھا مگر دوسرے ہی دن معلوم ہوا کہ آپ مرحومہ کی تجہیز و تکفین کے لئے بیرون ملک گئے ہوئے ہیں۔

میری جانب سے تعزیت قبول فرمائے۔ اللہ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ اور بچوں کو صبر کا حوصلہ دے۔

ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی (کراچی) ۲۴/نومبر ۲۰۰۲ء

جناب حمایت علی شاعر صاحب

آپ کی اہلیہ کی وفات کی خبر اخبار میں پڑھی، دکھ ہوا۔ میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ پاک مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔

حمایت بھائی ہم سب فانی ہیں ہم سب کو یہاں سے جانا ہے۔ جو شخص برس ہا برس سے ساتھ ہو وہ اتنی یادیں چھوڑ جاتا ہے کہ ہم ان یادوں کو مشکل سے ہی بھول پاتے ہیں۔ دراصل یہ یادیں ہی ہمارا اثاثہ ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر عبدالحق خاں حسرت کاسگنجوی (حیدرآباد، سندھ) ۷/جون ۲۰۰۳ء

جناب حمایت علی شاعر صاحب

آپ کی اہلیہ کے داغ مفارقت کا افسوس ہے ہی۔ اس بات کا افسوس ہے کہ اس سلسلے

حق مغفرت کرے

(تعزیت نامے)

تعزیتی قرارداد

بہادر یار جنگ اکادمی۔ کراچی

اکادمی کی مجلسِ انتظامی کا ایک خصوصی اجلاس مورخہ ۲۳/ نومبر ۲۰۰۲ء بروز ہفتہ ۴/ بجے شام دفتر اکادمی میں زیرِ صدارت پروفیسر میر حامد علی (صدر اکادمی) منعقد ہوا۔ جس میں پروفیسر حمایت علی شاعر کی اہلیہ محترمہ کے انتقال پر مندرجہ ذیل قرارداد تعزیت منظور کی گئی۔

''آج کا یہ اجلاس معروف شاعر وادیب اور دانشور جناب حمایت علی شاعر کی اہلیہ کے انتقال پر اپنے دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے حضور دعا گو ہے کہ وہ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور جناب حمایت علی شاعر و جملہ متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین''۔ مشترکہ دعائے مغفرت کے بعد اجلاس اختتام پذیر ہوا۔

پروفیسر خواجہ قطب الدین

CONSULATE GENERAL OF JAPAN. KARACHI.

Dear Mr. Himayet Ali Shair,

I read the sad news of your wife's demise with a heartfelt grief. I find very hard to explain my feelings on this tragedy with you. Please accept my heartiest sympathies in these sad moments of your life. May Allah Almighty give you courage to bear this immense loss and may the departed soul of hers rest in peace in Jant-ul-Firdos. Amen!

Please Know that I am beside you in this hard times.
Sincerely

Shigeyuki Ataka

روز نامہ ''جنگ'' کراچی

جمیل الدین عالی (ماخوذ، کالم ''نقار خانے سے'') یکم، دسمبر ۲۰۰۲ء

بیگم حمایت علی شاعر ایک عظیم خاتون تھیں

اب برادرم حمایت علی شاعر کی چار اولادیں امریکہ اور کینیڈا میں ہیں۔ پچھلے دنوں ان کی بیگم ٹورانٹو گئیں۔ جگر کا سرطان تھا۔ نا قابل علاج ثابت ہوا۔ عمر اندازاً پینسٹھ برس انتقال کر گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی چھوٹی اولاد وہاں ہے اس نے والد اور دوسرے بہن بھائیوں کی اجازت سے انہیں ٹورانٹو میں ہی دفن کر دیا۔ وہ ایک پڑھی لکھی اور سلیقہ مندہی نہیں ایک نہایت دلیر اور منتظم خاتون تھیں۔ حمایت علی شاعر کی ساری زندگی بڑی معاشی کشمکش میں گزری ہے جب انہیں لاہور اور حیدرآباد بطور خاص لاہور میں برسوں رہنا پڑا۔ ان کے بڑے ہوتے ہوئے آٹھ بچوں کی تمام تربیتی ذمہ داری ان محترم خاتون پر رہی اور جاننے والے جانتے ہیں کہ ان کے سب بچے زیور تعلیم سے آراستہ، محنت کے عادی اور مہذب ہیں (تین تو ڈاکٹر یعنی طبیب نکلے) خود حمایت علی شاعر بہت سے دوسرے ''آزاد فکر'' شعرا کے برخلاف بھٹک نہیں سکے۔ ایک مسلسل مصنف ثابت ہوئے۔ ان کی منظوم خودنوشت سوانح عمری'' آئینہ در آئینہ'' بے شمار اہم مقامات کی گواہ ہے..... فی الحال یہ صرف چند سطریں..... اللہ انہیں غریق رحمت کرے۔ مجھے ان کی اچھی دوست اپنی بیوی سے جو کچھ معلوم ہوتا رہا، اس کی بنا پر میں بآسانی انہیں ایک عظیم خاتون کہہ سکتا ہوں۔

حمایت علی شاعر کا ٹورانٹو میں فون نمبر ہے001-416-231-6839

پروفیسر عبدالقوی ضیاء (سڈبری۔کینیڈا)   ۲۲/نومبر۲۰۰۲ء

حمایت صاحب

سلام و نیاز

خدا مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور آپ کو صبر ایوب،
میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بلا تامل حکم.....

پروفیسر عبدالقوی ضیاء (سڈبری۔کینیڈا)   ۲۵/نومبر۲۰۰۲ء

برادرم حمایت

سلام مسنون

آپ کو صبر کی تلقین کرتے وقت خود میرا کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے، آپ کا غم تھوڑا بہت میں سمجھ سکتا ہوں کہ خود میری بیوی سخت بیمار ہیں۔ رات کو کال کیا تھا تو کہنے لگی کہ طبیعت سخت خراب ہے۔ ہسپتال جا رہی ہوں۔ صبح معلوم کیا تو پتہ چلا کہ ہسپتال میں داخل ہیں۔ کبھی ہسپتال کے باہر کبھی اندر، خدا انہیں صحت دے۔ آپ کا غم بٹاؤں تو کس طرح، میرے لائق جو حکم بھی ہو۔ کسی کے ذریعہ مطلع فرما دیجئے۔ صدق دل سے بجالاؤں گا۔

پروفیسر عبدالقوی ضیاء (سڈبری۔کینیڈا)   ۲۷/نومبر۲۰۰۲ء

ڈیرسٹ حمایت

السلام علیکم

بہت سے ایسے زخم ہیں جو باوجود ہزار کوشش کبھی مندمل نہیں ہوتے اور بہت سے ایسے غم ہیں جو ان کو بھلانے پر بھی بھلائے نہیں جاتے۔ بھابھی کی جدائی کا غم اسی طرح کا ہے، خدا آپ

کو ہمت دے اور غم سہنے کی سکت۔ میں ان کے لئے دعا گو ہوں کہ خدا تعالیٰ انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، میرے لائق کوئی خدمت؟

God Bless her soul
May god give you the Strength to bear it.
Warmest wishes for a season of peace & more peace.

ZIA.

ڈاکٹر الیاس عشقی (حیدرآباد) ۱۹/مارچ ۲۰۰۳ء

برادرِ گرامی حمایت علی شاعر صاحب

میں علاج کے لئے اپنے بیٹے کے پاس ریاض (سعودی عرب) گیا ہوا تھا کئی ماہ بعد آیا آپ کو خط لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ بیگم صاحبہ کے انتقال کی خبر سنی۔ صدمہ ہوا کہ ایک عمر کا ساتھ چھوٹ گیا۔ اس عمر میں یہ صدمہ واقعی ناقابلِ برداشت ہوتا ہے۔ کیسے آپ نے برداشت کیا ہوگا اللہ ہمت دیتا ہے ایسے میں صبر کی تلقین کے لئے لوگوں کو الفاظ مل جاتے ہوں گے مجھے تو الفاظ پر اتنی قدرت نہیں ہے جو سانحہ ہوا ہے اس کے سلسلے میں آپ کو اور صاحبزادگان کو مناسب الفاظ میں کچھ لکھ سکوں۔ جب مجھے اتنا صدمہ ہوا ہے تو آپ لوگوں پر کیا گزری ہوگی، اس کا کچھ اندازہ ہی لگا سکتا ہوں۔ رواجی الفاظ ہی رہ رہ کر قلم کی زبان پر آ رہے ہیں لیکن یہ قطعاً رواجی نہیں ہے یہ میری اور میری اہلیہ کے دل کی آواز ہے۔ ہم جس حد تک ممکن ہو سکتا ہے آپ کے غم میں شریک ہیں اور عرض کر سکتے ہیں کہ صبر کے سوا چارہ نہیں ہے۔ خدا مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

خط اس لئے بھی لکھنا چاہتا تھا کہ میرے ایک ہزار دوہوں کی کتاب تقریباً چھپ گئی ہے۔ اسی میں آپ کی ایک مشہور نظم جو سندھ سے متعلق ہے آپ کے نام کے ساتھ بہ ترمیم دوہے والی میں شامل کر لی ہے اور اعتراف کر لیا ہے۔ یہ میری جانب سے خراجِ عقیدت دوستی سمجھئے۔

روزنامہ قومی اخبار کراچی 3 25 نومبر 2002

کمانڈر روشن خیال سے ممتاز شخصیات کی تعزیت

کراچی (اسٹاف رپورٹر) صدارتی ایوارڈ یافتہ معروف شاعر حمایت علی شاعر کی اہلیہ اور آئی ایس پی آر نیوی کے ترجمان کمانڈر روشن خیال اور شاعر اوج کمال کی والدہ کے انتقال پر مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی ممتاز شخصیات نے تعزیت کی ہے جن میں جمیل الدین عالی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، کرنل (ر) [illegible] اشفاق حسین، کرنل (ر) [illegible]، قومی اخبار گروپ کے چیف ایڈیٹر الیاس شاکر، [illegible] بیگ، حبیب الرحمان گرامی، شیخ [illegible] الرحمان، سعادت جعفری، محسن [illegible] انصاری، فاضل جمیلی، سرور خان، ڈاکٹر اسلم [illegible]، ڈاکٹر محمود اظہر، [illegible] صدیقی، ایس زیدی، [illegible] شاہد کمال، [illegible] امام رضوی، سجاد میر، شاہد اقبال، شعیب خان، [illegible] جعفری، رانا اقبال، [illegible]، رضوان صدیقی، [illegible] سول و فوجی افسران، صحافی اور شاعر شامل ہیں۔ مرحومہ کا سوئم آج بعد نماز ظہر ان کے مکان نمبر 45-CB الفلاح سوسائٹی شاہ فیصل کالونی کراچی پر منعقد ہوگا۔

روزنامہ ایکسپریس، کراچی، پیر، 25 نومبر 2002ء

حمایت علی شاعر، کمانڈر روشن خیال اور اوج کمال سے تعزیت

کراچی (پ ر) معروف ادبی فورم خیال اکیڈمی کے روح رواں اور اردو سندھی و پنجابی کے شاعر محترم اسلم خیال نے بین الاقوامی شہرت کے حامل حمایت علی شاعر کی اہلیہ، آئی ایس پی آر (نیوی) کراچی کے کمانڈر روشن خیال اور پروفیسر اوج کمال کی والدہ کے انتقال پر گہرے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔ اپنے تعزیتی بیان میں انہوں نے کہا کہ حمایت علی شاعر اور ان کے صاحبزادوں کیلئے یہ صدمہ انتہائی بڑا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے سوگواروں کو یہ غم برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

روزنامہ صحافت کراچی ۲۳ نومبر ۲۰۰۲ء

حمایت علی شاعر کی اہلیہ کا سوئم کل ہوگا

کراچی (صحافت نیوز) معروف شاعر حمایت علی کی اہلیہ اور آئی ایس پی آر نیوی کے کمانڈر روشن خیال کی والدہ گزشتہ روز کینیڈا میں انتقال کر گئیں۔ وہ طویل عرصے سے جگر کے عارضے میں مبتلا تھیں۔ انہیں علاج کے لئے کینیڈا لے جایا گیا تھا۔ تدفین کینیڈا میں ہی ہوگی۔ سوئم اتوار کو بعد نماز ظہر جامع مسجد [illegible] شاہ فیصل کالونی کراچی میں ہوگا۔ خواتین کے لئے سی بی 45 الفلاح سوسائٹی شاہ فیصل کالونی میں انتظام کیا گیا ہے۔ آئی ایس پی آر کے ڈائریکٹر جنرل [illegible] بریگیڈیئر صولت رضا اور آئی ایس پی آر کراچی کے [illegible] کرنل [illegible] نے کمانڈر روشن خیال اور اوج کمال سے دلی تعزیت کرتے ہوئے دعائے مغفرت کی ہے۔

روز نامہ جسارت کراچی

کمانڈر روشن خیال کی والدہ انتقال کر گئیں

سوئم کل ہوگا

کراچی (اسٹاف رپورٹر) آئی ایس پی آر نیوی کے کمانڈر روشن خیال کی والدہ اور ممتاز شاعر حمایت علی شاعر کی اہلیہ جمعہ کو انتقال کر گئیں۔ وہ جگر کے علاج کیلئے ٹورانٹو کینیڈا گئی ہوئی تھیں۔ مرحومہ کا سوئم اتوار کو بعد نماز ظہر جامع مسجد [illegible] شاہ فیصل کالونی میں ہوگا۔ خواتین کے لیے مرحومہ کی رہائش گاہ 45/C-B الفلاح سوسائٹی شاہ فیصل کالونی میں اہتمام کیا گیا ہے۔

اشاعت کا 24 واں سال
ہفت روزہ
انٹرنیشنل
پاکیزہ
ٹورانٹو
مدیر و پبلشر۔ صبیح الدین منصور

پاکستان کے معروف شاعر جناب حمایت علی شاعر کی اہلیہ ٹورانٹو میں رحلت فرما گئیں

ٹورانٹو (پاکیزہ نیوز) جمعرات ۲۱ نومبر شام پانچ بجے کے قریب ٹورانٹو کے نواحی علاقے ایٹوبیکو میں مقیم اپنی بیٹی اور داماد کے گھر حمایت علی شاعر کی اہلیہ انتقال فرما گئیں (انا للہ و انا الیہ راجعون)۔ جمعہ کے روز مدینہ مسجد میں انکی نماز جنازہ پڑھائی گئی اور تدفین [illegible] میں کی گئی جس میں شہر کے ادبی اور سماجی حلقوں اور انکے عزیز اقارب اور ۵۵ سالہ ازدواجی زندگی کے شریک جناب حمایت علی شاعر نے بھی شرکت کی۔ ہفتے کے روز انکے لئے فاتحہ اور قرآن خوانی کی گئی۔ ادارہ پاکیزہ انٹرنیشنل مرحومہ کیلئے دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ انکو جنت میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور حمایت علی شاعر اور انکے لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین

روزنامہ امروز کراچی (8) ہفتہ 23 نومبر 2002

کمانڈر روشن خیال کی والدہ انتقال کر گئیں
سوئم قل شاہ فیصل کالونی کراچی میں ہوگا

کراچی (سٹاف رپورٹر) معروف شاعر حمایت علی شاعر کی اہلیہ اور آئی ایس پی آر نیوی کے کمانڈر روشن خیال کی والدہ [illegible]

روزنامہ سیاست کراچی 7 23 نومبر 2002

روشن خیال کی والدہ انتقال کر گئیں
راشد قریشی و دیگر کا اظہار تعزیت
مرحومہ کا سوئم قل [illegible] ہوگا

[illegible]

[illegible]

25 NOV 2002

حمایت علی شاعر کی اہلیہ اور کمانڈر روشن خیال کی والدہ کا انتقال

[illegible]

روزنامہ جنگ کراچی اتوار یکم دسمبر 2002ء

نقار خانے میں

☆☆☆

جمیل الدین عالی

بیگم حمایت علی شاعر ایک عظیم خاتون تھیں

حمایت علی شاعر کو صدمہ

اب برادرم حمایت علی شاعر کی چار اولادیں امریکہ یا کینیڈا میں ہیں۔ پچھلے دنوں ان کی بیگم ٹورانٹو گئیں جگر کا سرطان تھا ناقابل علاج ثابت ہوا مہر اندازاً تین ہفتے میں انتقال کر گئیں انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ان کی چھوٹی اولاد وہاں ہے اس نے والد اور دوسرے بہن بھائیوں کی اجازت سے انہیں ٹورانٹو میں ہی دفن کر دیا۔ وہ ایک پڑھی لکھی اور سلیقہ مند ہی نہیں ایک نہایت دلیر اور عظیم خاتون تھیں۔ حمایت علی شاعر کی ساری زندگی بڑی معاشی کشاکش میں گزری ہے۔ جب انہیں لاہور اور حیدرآباد بطور خاص لاہور میں برسوں رہنا پڑا ان کے بڑے ہوتے ہوئے آٹھ بچوں کی تمام تربیتی ذمہ داری ان محترم خاتون پر رہی اور جاننے والے جانتے ہیں کہ ان کے سب بچے زیور تعلیم سے آراستہ، محنت کے عادی اور مہذب ہیں۔ (تین تو ڈاکٹر یعنی طبیب نکلے)۔ خود حمایت علی شاعر بہت سے دوسرے "آزاد فکر" شعراء کے برخلاف بھٹک نہیں سکے۔ ایک مسلسل مصنف ثابت ہوئے۔ ان کی منظوم خود نوشت سوانح عمری "آئینہ در آئینہ" بے شمار اہم مقامات کی گواہ ہے۔۔۔۔ فی الحال یہ صرف چند سطریں۔۔۔۔ اللہ انہیں غریق رحمت کرے مجھے ان کی اچھی دوست اپنی بیوی سے جو کچھ معلوم ہوتا رہا اس کی بنا پر میں آسانی انہیں ایک عظیم خاتون کہہ سکتا ہوں۔ حمایت علی شاعر کا ٹورانٹو میں فون نمبر ہے 001-416-231-6939

(11) 28 نومبر 2002ء

روزنامہ نوائے وقت کراچی

حمایت علی شاعر روشن خیال اور اوج کمال کو صدمہ

اردو کے ممتاز شعر حمایت علی شاعر کی اہلیہ اور کالم نگار روشن خیال، اوج کمال مدیر دنیائے ادب کی والدہ کے کینیڈا میں انتقال پر ادبی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی حلقوں نے اظہار تعزیت کیا ہے۔ مرحومہ کی فاتحہ سوئم اتوار کو حمایت علی شاعر کی قیام گاہ پر ہوئی جس میں ممتاز شعراء ادباء اور دیگر شخصیات نے شرکت کی ان میں جمیل الدین عالی،

ایس ایچ ہاشمی، سحر انصاری، فراست رضوی، یاور مہدی، شاہدہ تبسم، خالدہ عظمیٰ، شجاعت بیگ، سجاد میر، راؤ اقبال، ریحانہ احسان، حجاب عباسی، مہرور حسنین جلیسی، حسن ظہیر، صادق مدہوش، انعام نادر، خالد معین، ماہمیر، عزیزین حسیب عنبر، روبینہ وفا، بابا مجی، وکیل فاروقی، سلمیٰ ریاض، سعادت جعفری، شیخ مظفر عالم کے علاوہ متعدد شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ نوائے وقت کراچی

حمایت علی شاعر کی اہلیہ کی فاتحہ سوئم آج ہو گی

کراچی (اسٹاف رپورٹر) ممتاز شاعر حمایت شاعر کی اہلیہ اور آئی ایس پی آر کے کالم نگار روشن خیال کی والدہ سیدہ معراج نسیم کی فاتحہ سوئم اتوار کو بعد نماز ظہر جامعہ مسجد تاج محل شاہ فیصل کالونی نمبر ایک میں ہو گی خواتین کے لئے رہائش گاہ C/B-45 الفلاح سوسائٹی میں انتظام کیا گیا ہے۔ مرحومہ کا جمعہ کو کینیڈا میں انتقال ہو گیا تھا۔

AWAZ
آواز
FortNightly پندرہ روزہ
Published by: East West Horizon, Issue 70
P.O.Box 22133, Toronto, Ontario, Canada, M4H1N9
Tel.: (416) 429-2267 Fax: (416) 429-4806 / E-mail: awaz99@hotmail.com
NOVEMBER 24, 2002

صفحہ (۷) آواز

اظہار تعزیت ۔ انتقال پُر ملال

پیر انتہائی رنج و غم کے ساتھ یہ خبر سنی جائے گی کہ پاکستان کے مشہور و معروف شاعر و ادیب جناب حمایت علی شاعر کی اہلیہ محترمہ معراج نسیم ماہ رمضان المبارک میں بروز جمعرات ۲۱ نومبر بوقت افطار انتقال کر گئیں (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔ مرحومہ کچھ عرصے سے ٹورانٹو میں اپنی بیٹی اور داماد جناب مسعود رضوی کے ہاں مقیم تھیں اور زیر علاج تھیں اسی علالت کے باعث انتقال کر گئیں۔ مرحومہ ایک نیک خاتون تھیں، ادبی اور ثقافتی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتی تھیں اور مشہور افسانہ نگار بھی تھیں۔ حیدرآباد دکن سے شائع ہونے والا ہفت روزہ انگریزی "پرواز" میں صفحہ خواتین کی انچارج بھی رہ چکی ہیں۔ مرحومہ کی نماز جنازہ بعد نماز جمعہ مسجد ٹورانٹو میں ادا کی گئی اور ایجاکس کے قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔ جس میں سوگواروں کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔ سوگواروں میں ان کے شوہر، چار بیٹے اور چار بیٹیاں کے علاوہ کئی افراد خاندان اور دوست احباب شامل ہیں۔

ادارہ "پندرہ روزہ آواز" محترمہ کے انتقال کر جانے پر اپنے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہے کہ خدا مرحومہ کو جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے مراتب بلند فرمائے اور مرحومہ کے تمام متعلقین اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے (آمین ثم آمین)۔

ادارہ "آواز"

محمد حمید الدین

روزنامہ جنگ کراچی اتوار 15 دسمبر 2002ء

حمایت علی شاعر کا اظہار تشکر

کراچی (پ ر) ممتاز شاعر اور دانشور حمایت علی شاعر امریکا سے وطن واپس آگئے۔ انہوں نے ان تمام احباب، کرم فرماؤں، ادیبوں اور شاعروں کا شکریہ ادا کیا ہے جنہوں نے ان کی اہلیہ کی وفات پر بذریعہ خطوط، بذریعہ فون یا گھر پر آکر اظہار تعزیت کیا۔

ابوالامتیاز ع س مسلم (کراچی) ۲/دسمبر۲۰۰۲ء

برادرم حمایت علی شاعر

جمیل الدین عالی صاحب کے کالم سے یہ اطلاع میرے لئے نہایت غم انگیز ہے کہ آپ کی اہلیہ محترمہ طویل علالت کے بعد اس دارفانی سے انتقال فرما گئیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون یہ صدمہ جانکاہ یقیناً آپ پر بہت بھاری ہوگا کہ عمر بھر کا ساتھ یوں دفعتاً ختم ہوگیا، لیکن یہ حادثہ کسی نہ کسی صورت میں سب کا مقدر ہے۔ ہم خود اب عمر کے اس دور میں ہیں کہ کسی وقت بھی بلاوا آسکتا ہے لیکن اس غم میں جان ہلکان کرنے سے بھی اس کا مداوا تو ممکن نہیں۔ میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے وہ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے اور استقامت سے اس غم سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

لعل بخش جسکانی (ایڈیٹر Grassroots۔ سندھ یونیورسٹی۔ جام شورو)

محترم جناب حمایت صاحب ۲۰۰۲/۱۲/۱۲ء

''ڈان'' اخبار میں آپ کی بیگم صاحبہ کے انتقال کی اندوہناک خبر پڑھ کر بہت ہی افسوس ہوا۔ خدا مرحومہ کو جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ سب کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔ یونیورسٹی سے ریٹائر ہونے کے بعد آپ سے کوئی ملاقات نہیں ہوئی۔ ایک عرصہ ہوا کبھی کبھار ٹی، وی پر آپ کو دیکھ لیتے ہیں۔ میں بھی یونیورسٹی سے ریٹائر ہو چکا ہوں میری بھی آپ کی طرح عمر بڑی لکھی ہوئی تھی۔ میں کراچی روبرو آ کر تعزیت کرتا لیکن میرے Hipjicnt کا آپریشن ہوا ہے اور ابھی سفر کرنے کی ممانعت ہے ویسے میں ٹھیک ہوں۔ میری ایک آدھ کتاب آ چکی ہے۔ دوزیر تحریر ہیں۔ آپ کی بھی کچھ کتابیں آ چکی ہیں۔

آپ کے بیٹے اوج کمال کی لکھی ہوئی تحقیق پر کتاب ''فن تحقیق'' کی بڑی تعریف ہے میں نے اپنے اسٹوڈنٹس کو 1999ء میں یہ کتاب خریدنے کو کہا تھا اور کچھ نے کراچی سے خریدی

تھی لیکن یہاں حیدرآباد میں یہ کتاب نہیں مل رہی مجھے اس کتاب کی سخت ضرورت ہے مہربانی کر کے ایک عدد کاپی مجھے بھجوادیں شکریہ۔

حیدرآباد ضرور آیئے اور میرے پاس ضرور آئے گا۔ خدا آپ کو بمع اپنے اہل وعیال آباد وشاد رکھے۔ مہربانی۔

ORIENT MCCANN-ERICKSON-KARACHI.
Mr Himayat Ali Shair
Deeply grieved to hear of the sad demise of your wife. Kindly Accept my heartfelt condolences. May allah rest the departed soul in eternal peace and give you and members of the family strength to bear this irreparable loss (ameen)

with personal regards
S.H. Hashmi 27-11-2002

Commander Roshan Khayal
Deeply Grieved to hear of the sad demise of your mother. Kindly accept my heartfell condolences.May Allah rest the departed soul in eternal peace and give you and members of the family strength to bear this irreparable loss (aameen)

with personal regards

S.H.Hashmi 27-11-2002

افتخار اجمل شاہین (کراچی) ۲۷/نومبر ۲۰۰۲ء

جناب اوج کمال صاحب

اخبارات کے ذریعہ آپ کی والدہ محترمہ کے انتقال پر ملال کی خبر ملی۔ یہ سن کر بہت افسوس ہوا۔ مگر اس معاملے میں انسان مجبور ہے جو دنیا میں آتا ہے اسے واپس جانا ہی ہوتا ہے۔

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

ماں خدا کی بہت بڑی نعمت ہوتی ہے اس کا سایہ خدا کی رحمت کا سایہ ہوتا ہے۔ آج وہ شفقت اور محبت کا سایہ آپ لوگوں کے سر سے اٹھ گیا۔ میں بھی شفقت مادری سے محروم ہو چکا ہوں مجھے اس بات کا پوری طرح احساس ہے۔ اب سوائے صبر کے اور کیا جا سکتا ہے آپ بھی صبر کریں اور والدہ مرحومہ کے لئے دعائے خیر کریں۔ اللہ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور ان کے درجات بلند کرے اور آپ کو آپ کے بھائیوں اور حمایت علی شاعر صاحب کو اللہ تعالیٰ صبر و جمیل عطا فرمائے۔

صابر براری (کراچی) ۲۵/نومبر ۲۰۰۲ء

برادرم حمایت علی شاعر صاحب

مقامی اخبارات کے ذریعے آپ کی اہلیہ محترمہ کے انتقال پر ملال کی خبر ملی بے حد افسوس ہوا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ صدمہ آپ کے لئے اور بچوں کے لئے ناقابل برداشت ہے لیکن صبر کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا کرے۔ آمین

شاہ مصباح الدین شکیل (نیویارک) ۲۳/نومبر ۲۰۰۳ء

برادر محترم حمایت علی شاعر صاحب

عزیزم اوج کمال صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

آج ہی حسن چشتی صاحب/ خلیل الزماں خاں صاحب نے شکاگو سے یہ المناک اطلاع دی کہ آپ کی شریک حیات نے کینیڈا میں داعی اجل کو لبیک کہا ہے۔ مجھے اس خبر سے بے حد افسوس ہوا نصف صدی سے زائد کا یہ رشتہ ٹوٹ گیا۔ آپ کے جذبات اور اضطراب کا میں اندازہ کرسکتا ہوں، یہ دن سب پر آنا ہے ۔کل نفس ذائقہ الموت ۔۔۔۔۔مشیت الٰہی میں کس کو دخل ہے، اللہ تعالیٰ مرحومہ کی مغفرت فرمائے ۔ جنت الفردوس عطا فرمائے اور آپ کو جملہ افراد خاندان کو صبر جمیل اور اس عظیم سانحہ کو برداشت کرنے کی طاقت عطا فرمائے۔ آمین

میں نے انہیں انور جبیں صاحب کے مجلّہ ''شخصیت'' کے ''حمایت علی شاعر نمبر'' کی رسم اجرائی کی تقریب میں سنا اور دیکھا تھا۔ جس طرح انہوں نے اپنے بچوں کی تربیت کی اور آپ کا ساتھ دیا یہ خوبیاں ان کی مغفرت کا باعث بنیں گی۔ اللہ اجر دے۔

مجھے پتہ نہیں کہ آپ کینیڈا میں ہیں یا کراچی میں۔ میری تعزیت قبول کیجئے۔ خصوصیت سے اَوجِ کمال صاحب کہ آپ کے افراد خاندان میں ان ہی سے واقف ہوں۔

انشاءاللہ کل سے میرا اعتکاف ہوگا۔ مرحومہ کی مغفرت کے لئے دعا کروں گا۔

گلزار جاوید (''چہارسو'' راولپنڈی) ۱۴/جنوری ۲۰۰۳ء

مخدوم حمایت بھائی قبلہ!

آپ کا مکتوب ملنے کے بعد سے پورا گھر سوگواری کی کیفیت میں مبتلا ہے۔ بھابھی

صاحب کی وفات کی اطلاع ملتے ہی میں نے آپ کے دولت کدہ پر فون کیا تھا مگر آپ کینیڈا میں زندگی کا سب سے بڑا صدمہ جھیل رہے تھے۔

''الفاظ'' میرے اور اہلیہ بلکہ گھر کے سبھی افراد کے جذبات کی ترجمانی نہیں کر سکتے۔ ہم سب آپ کی وفا، ایثار اور جواں ہمتی کو سلام پیش کرتے ہیں اور بھابھی صاحبہ محترمہ کے درجات کی بلندی کے لئے اپنے پروردگار کے حضور دست بہ دعا ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کے حوصلوں کو جواں اور محبتوں کو توانا رکھے (آمین ثم آمین)

بشیر موجد (لاہور)   ۱۲/مارچ ۲۰۰۳ء

برادر محترم جناب حمایت علی شاعر صاحب

آج ہی کراچی سے آئے ایک دوست کی زبانی خبر ملی کہ آپ کی شریک حیات طویل علالت کے بعد اپنے خالق حقیقی کی خدمت میں پہنچ گئی ہیں۔ اس عمر میں شریک حیات کا بچھڑنا خاصہ پریشانی کا باعث ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنی رحمت میں جگہ دے اور آپ کو اپنی امان میں رکھے۔

پروفیسر ڈاکٹر طاہر سعید ہارون (لاہور)   ۲۵/ جنوری ۲۰۰۳ء

مکرمی و محترمی حمایت علی شاعر صاحب

بھابھی محترمہ کی رحلت کا سن کر انتہائی صدمہ پہنچا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

کراچی آپ کے گھر تعزیت کے لئے فون کیا تو پتہ چلا کہ آپ کینیڈا میں تھے موصوفہ رحمت اور شفقت کا پیکر تھیں۔ آپ کے ہاں جب بھی ان سے ملاقات ہوئی وہ کمال خندہ پیشانی سے پیش آئیں۔ ابھی تک یقین نہیں آرہا کہ وہ ہمیں داغ مفارقت دے چکی ہیں۔ خدائے بزرگ و برتر انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ہم سب کو صبر جمیل بخشے۔ آمین

میرا پانچواں مجموعہ کلام اسی ماہ طباعت کے مراحل سے گزرا۔ اولین فرصت میں آپ کی نذر کر رہا ہوں ۔ شاعری کے حوالے سے میں نے آپ سے بہت کچھ سیکھا جس کے لئے تاحیات ممنون رہوں گا۔ آپ کی ہدایت کے مطابق اپنا اگلا دوہوں کا مجموعہ اصل دوہا چھند میں ہوگا اس چھند میں تقریباً چھ سو دوہے اکٹھے ہو چکے ہیں ۔ اب اپنی توجہ انہیں چھپوانے کی طرف مبذول کروں گا۔ کراچی آنے پر انشاءاللہ حاضری دوں گا۔

پرکاش چندر (دہلی) ۲۷/ جون ۲۰۰۳ء

برادرم حمایت صاحب

یہ خط فوراً فون کٹنے کے بعد لکھ رہا ہوں ۔ جب میری نظر آپ کی نظم ’’یہ سچ ہے‘‘ پڑ پڑھی تو پڑھتے ہی فون اٹھایا تاکہ مختصر سی بات تو ہو سکے کیونکہ میرا فون کارڈ بہت کم رہ گیا تھا۔ تمہارے آنے اور دو لفظ کہنے میں ہی 45 روپے کا کارڈ کا بیلنس ختم ہو گیا۔ تو سوچا خط ہی لکھ دوں ۔

مجھے بھابھی کے گزرنے کا نکہت بھائی نے بتایا تھا فوراً فون کیا اور آپ کے فرزند نے بتایا کہ آپ امریکہ میں ہیں ۔ میں نے افسوس ظاہر کیا اور ہدایت کی آپ کے واپس آتے ہی مجھے اطلاع دیں تاکہ آپ کو ذاتی طور پر تعزیت کر سکوں لیکن دوحہ میں ملاقات کے دوران 2001ء میں انہوں نے ہمیں قدرے نظر انداز ہی کر دیا۔ مثلاً اب تک ’’جمیل الدین عالی نمبر‘‘ کا منتظر ہوں ۔ جو آپ کے داماد سے کتابوں کا سانحہ ہوا اس کو تو بھولنا ہی مناسب ہے ۔ میری زندگی میں سب سے بڑا دکھ تھا میرے بڑے بیٹے کا 27 برس کی عمر میں انتقال ۔ 1979ء میں 21 برس کی بیوی اور 23 ماہ کی لڑکی چھوڑ گیا اندر سے ہم بہت ٹوٹے مگر میں نے اپنا سر پانی سے اوپر رکھا کیونکہ اگر میں ڈوبتا تو خاندان ڈوب جاتا۔ آپ کی 54 برس کی رفاقت بھابھی کے چلے جانے سے ختم ہو گئی مگر میرا مشورہ ہے کہ آپ کے پھیلے ہوئے خاندان کی طرف آپ کی ذمہ داریاں آپ پر یہ فرض

عائد کرتی ہیں کہ ہمت رکھو اور نارمل محسوس ہونے کا تاثر دو۔ یہ تو نہایت مشکل کیونکہ نقصان تو نقصان ہے مگر آپ اپنی باقی دنیاوی ذمہ داریوں کا خیال کریں اور میری درخواست پر غور کریں اور ہر ممکنہ کوشش کریں اپنے آپ کو Pull up کرنے کی۔

اس سے پہلے بھی میں بھابھی کا افسوس کر چکا ہوں۔ آپ بھول رہے ہیں۔ اب تو میں آپ کو خود آپ کے بارے میں ہی کہنا چاہوں گا شاید میری حقیر بات کسی قابل ہو۔

کلیم چغتائی (ماہنامہ رابطہ۔ کراچی) ۲۵/نومبر ۲۰۰۲ء

نہایت عزیز و محترم حمایت علی شاعر صاحب

مجھے اچھی طرح احساس ہے کہ یہ لمحات آپ اور تمام اہل خانہ کے لئے کس قدر کرب آمیز ہوں گے۔ ایک طویل اور نقش بردل رفاقت کا اختتام آپ کے لیے کیا قیامت لے کر آیا ہو گا، لیکن یہ احکم الحاکمین اور ارحم الراحمین کا فیصلہ ہے اور اس کے فیصلے کے آگے کس کی مجال کہ لب کشائی کر سکے۔ اسی نے اپنے لطف و کرم سے آپ کو رفیق زندگی عطا فرمایا اور اسی کے حکم پر وہ رفیق زندگی واپس لے لی گئی اور وہی ہے جو اس جاں گسل صدمے کو برداشت کرنے، اس پر صبر کرنے اور رب کی رضا پر راضی رہنے کی توفیق اور ہمت عطا فرما سکتا ہے۔

میں ''رابطہ'' کے چیف ایڈیٹر جناب محمد عیاض غزنوی اور ''رابطہ'' کی کل مجلس ادارت کی جانب سے اس سانحے پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتے ہوئے دعا گو ہوں کہ رب کریم آپ کی اہلیہ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ رحمتوں کے اس مہینے میں آپ سب پر اپنی رحمتوں کی بارش برسائے، غم زدہ دلوں کو سکون بخشے اور دنیا و آخرت کی بھلائیوں سے نوازے۔

سید احمد رئیس (کراچی) ۲۴/نومبر ۲۰۰۲ء

محترم حمایت صاحب

بھابھی محترمہ کے اچانک انتقال کی خبر پڑھ کر بے حد صدمہ ہوا۔ اللہ تبارک تعالیٰ آپ کو اور گھر میں سب کو اس صدمۂ جانکاہ کو برداشت کرنے کی ہمت عطا فرمائے اور مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے (آمین) مجھے بھی اپنے اس غم میں شریک سمجھئے۔ اللہ تعالیٰ ان کی بخشش فرمائے۔ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

کمانڈر روشن خیال اور عزیزی اَوجِ کمال کو بطور خاص میری دلی تعزیت پیش فرمائیں

RANA IQBAL - KARACHI.
DEAR BLAND IQBAL.

Jo saneha aap sab kay sath guzra main us gham aur ranj mein aap sab key sath barabar Ki shareek hoon main bhi usi tarah takleef mehsoos kar rahi hoon jaisay aap sab. meri aik aur mushkil yeh hay aisay mauqay per merey paas bilkul alfaz nahee hotey aur agar kuch kehna chahoon bhi tu apnay alfaz khud ko khokhlay mehsoos hotay hein. sirf yeh samajh lo keh main poori tarah tum sab kay sath is takleef ko mehsoos kar rahi hoon. han tumhari saadat mandi aur jazbay ki main zuroor tareef karoon gi tum waqai himayat sahib kay laiq baitay ho aur jo kuch bhi tum nay kia, bay shak apna farz samjha ho ga lekin tumko Khuda-e-buzurg-o-bartar say is ki jaza zuroor milay gi. apni dulhan ko meir taraf say buhat si duaein aur piyar puhncha dena farheen ko bhi piyar baqi tamam logon ko agar main yaad hoon tu mera salam dena. Khuda tumhein apni aman mein rakhay. Himayat sahib ko buhat salam kehna. khuda hafiz. 27-11-2002

سید محمود خاور (کراچی) ۲۴/نومبر ۲۰۰۲ء

محترم حمایت علی شاعر صاحب

روشن خیال صاحب، اوج کمال صاحب

آپ کے گھرانے میں سانحۂ ارتحال کی خبر پڑھ کر بے حد دکھ ہوا۔ شرمندہ ہوں کہ خرابی صحت کے سبب تعزیت کے لئے خود حاضر نہ ہو سکا اور مجبوراً بذریعہ تحریر حاضر ہوں۔

جانتا ہوں کہ الفاظ اس عظیم صدمے کا مداوا نہیں ہیں لیکن وقتی سہارا ضرور ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ سیدہ معراج نسیم صاحبہ کی مغفرت فرمائے اور آپ تمام کو صبر جمیل عطا کرے۔

لے کے پھرتی ہیں آندھیاں جس کو
زندگی ہے وہ برگ آوارہ

نثار ترابی (راولپنڈی) ۲۷/نومبر ۲۰۰۲ء

جناب حمایت علی شاعر صاحب

گذشتہ روز اخبار کے ذریعے یہ افسوس ناک خبر مجھ تک پہنچی کہ بھابھی صاحبہ رضائے الٰہی سے انتقال کر گئی ہیں۔ یہ ایک ایسا دکھ ہے جو یقیناً ایک طویل مگر باوقار رفاقت اور ایثار کی اٹوٹ مثال بن کر آپ کے روز و شب کو نم آلود کرتا رہے گا۔ دعا ہے کہ مولائے کائنات مرحومہ کے آخری درجات میں سرفرازی عطا کرے اور آپ جملہ اہل خانہ کو صبر جمیل۔ میرے اور میرے اہل خانہ کے غم آلود جذبات برادرم اوج کمال تک بھی پہنچا دیجئے گا۔

رضوان عنائتی (کراچی) ۲۰۰۲/۱۲/۳۰ء

حمایت بھائی!

بھابھی کے انتقال پر مجھے بے انتہا دکھ ہوا ہے اور آپ کے غم کا مجھے بہت گہرا احساس ہے۔ دنیا میں دو رفیق ساتھیوں میں میاں بیوی کا جو رشتہ ہے اس کی کوئی برابری نہیں کرسکتا۔ اس تعلق میں جدائی چاہے عمر کے کسی حصے میں ہو نہایت روح فرسائی کا باعث ہے اور عمر کے آخری دور میں تو یہ حادثہ وہ گہرا گھاؤ لگاتا ہے۔

کہ جس کا دنیا میں کوئی ذریعہ سدباب نہیں کرسکتا۔ آپ کی دلی کیفیات میرے دل پر واضح ہیں۔ اللہ آپ کو صبر جمیل عطا کرے اور آپ پر اپنا کرم فرمائے۔

میں آپ سے اور آپ بچوں اور تمام متعلقین سے دل کی گہرائیوں سے تعزیت کرتا ہوں اور بھابی کی مغفرت کی دعائیں بھی۔

زاہد بابر (ادبی مرکز۔ واشنگٹن ڈی، سی) ۲/دسمبر۲۰۰۲ء

مائی ڈیر حمایت بھائی

پچھلے ہفتہ آپ سے بات ہوئی مگر تشنگی باقی رہی آپ ساری دنیا کے لئے بھلے ہی ''حمایت علی شاعر'' ہوں یہاں ادبی مرکز، واشنگٹن ڈی سی کے لئے ہمشہ ہردلعزیز ''حمایت بھائی'' ہی رہیں گے۔

پچھلے سال جون میں آپ لوگوں کی ادبی مرکز واشنگٹن کے انٹرنیشنل مشاعرے میں شرکت، گویا ابھی تک واشنگٹن کے ادبی حلقوں میں ایک یاد تازہ کی طرح معطر ہے۔

آپ دونوں کا خاص طور پر میرے غریب خانے پر قیام، بھابھی کی محبتیں، گھریلو ماحول اور بات چیت نے ہمیں اتنی جلدی اپنا بنالیا۔ ہمارے سارے افراد خانہ کے دلوں میں گھر کرلیا۔

میری بیگم ناہید اور میری بہو امل (اگر آپ کو یاد ہو تو امریکن مسلم ہے) بھابھی کو بہت یاد کرتے ہیں ان کی نصیحتیں ان کے تجربات کو گرہ سے باندھ لیا ہے۔ سب دعا گو ہیں ان کے لئے اور آپ سب کے لئے، ویسے بھی رمضان میں اللہ تعالیٰ صرف اپنے خاص بندوں ہی کو اپنے پاس بلاتا ہے۔

آپ کی ساری کتابیں پڑھیں بار بار پڑھیں۔ بلکہ پڑھ کر سنائیں آپ کا اور بھابھی کا ساتھ، آپ کا اور بھابھی کا ''جہاد'' اس دنیا کے ساتھ، اس معاشرے کے ساتھ، اپنے حالات سے مقابلے میں، آپ دونوں کا ساتھ یعنی ایک دوسرے کے اٹوٹ انگ یا جز لاینفک، ہماری اپنے بچوں کے لئے آئندہ زندگی میں آپ دونوں کی مثال ہم دیتے ہیں۔ اب دنیا تو لی جاتی ہے، رزلٹ دیکھ کر، امریکہ میں بھی Bottom Line بھی دیکھی جاتی ہے حمایت بھائی آپ اور بھابھی نے جس طرح اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت دی ہے وہ قابل تحسین ہے اور بھابھی کا وجود اس نتیجہ کا بہت زیادہ ذمہ دار ہے۔ خدا انہیں غریق رحمت کرے اور آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے آپ کو اتنا عظیم شاعر بنانے میں ان کا Devotion قابل تعظیم ہے۔

ایک بار پھر ادبی مرکز کے تمام اراکین آپ سب کے لئے دعا گو ہیں۔ آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔

سید جی آر۔ رضوی (تنظیم اردو۔ لیوٹن۔ برطانیہ) ۹/مارچ ۲۰۰۳ء

برادرم حمایت علی شاعر صاحب

امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ آپ کی رفیقۂ حیات اور ہماری بہن معراج کے انتقال پر ملال کی خبر روزنامہ ''جنگ'' لندن میں پڑھ کر اسی وقت میں نے آپ کو کینیڈا فون کیا تھا اور آپ ہی نے ٹیلی فون ریسیور اٹھا کر مجھ سے بات کی تھی۔ رفیقۂ حیات کی موت ایک عظیم صدمہ ہے جس میں، میں بھی شریک ہوں اللہ مرحومہ کو غریق رحمت کرے۔ آمین

میں نے ایک بار اپنے چھوٹے بھائی مسعود رضوی کو ٹیلی فون کیا تھا تو انہوں نے بتایا کہ آپ کراچی واپس چلے گئے ۔ اس بات کی تصدیق آپ کے ایک خط سے ہوئی جو ماہنامہ ''پرواز'' لندن کے فروری ۲۰۰۳ء کے شمارہ میں شائع ہوا۔ آپ کا خط اور بیگم مرحومہ کے نام پر آپ کی لکھی ہوئی نظم بھی پڑھی ۔ باوجود بچوں کے اصرار کے جو کہ کینیڈا میں ہیں آپ کے لئے یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ کینیڈا مستقل طور پر منتقل ہو جائیں یا نہیں کیونکہ بقول آپ کے ''یہاں بھی کچھ بچے ہیں اور میرا ماضی و حال، میری کتابیں، میرا سبھی کچھ یہاں ہے'' بہر حال خوب سوچ سمجھ کر قدم اٹھایئے ۔ چونکہ میں یہاں اکثر ادبی محفلوں اور مشاعروں کا انتظام کرتا ہوں اور ادیبوں اور شاعروں سے میرا رابطہ رہتا ہے اور میں ''پرواز'' کے معاونین میں سے ہوں ۔ لہٰذا آپ کا خط اور نظم پڑھنے کا موقع ملا۔

میری طرف سے تمام لوگوں کو سلام و دعا، امید کہ فراز بھی ٹھیک ہوں گے۔

(عزیز)

سردار سوز (لاہور) ۲۷/ مئی/ ۲۰۰۲ء

جنابِ اَوجِ کمال صاحب

جب سے آپ کو فون کیا ہے آپ کو خط لکھنے اور مجموعۂ کلام آپ کو بھیجنے کے متعلق سوچتا رہا۔ آج موقع ملا ہے۔ آپ کی والدہ محترمہ کا رحلت کرنا کوئی ایسا حادثہ نہیں جو آسانی سے بھلایا جا سکے ۔ میں ان کے لئے دعا کرتا ہوں اور اللہ آپ کے والد محترم جناب حمایت علی شاعر صاحب میرے عزیز دوست اور مہربان کو صبر جمیل عطا فرمائے اور آپ سب کو اس صدمہ کو برداشت کرنے کا حوصلہ، آج اس خط کے ساتھ آپ کو ''سوزِ دل'' مل جائے گا۔

قدیر زماں (حیدرآباد، دکن۔ انڈیا) ۲۴/مئی ۲۰۰۳ء

محترمی

مئی کے سب رس (حیدرآباد) میں آپ کا خط مغنی صاحب کے نام اور نظم ''تمہارے بعد'' پڑھا۔ چھ مہینوں سے زیادہ ہو چکے ہم لوگوں کو اس کی خبر نہ تھی۔ مہینے ہوں یا سال ہمیشہ آپ کا غم تازہ ہی رہے گا۔ آپ کے بہت سے چاہنے والے اس غم میں شریک ہیں۔ میں بھی ان میں شامل ہوں۔

۱۹۷۰ء سے قبل سلیمان اریب جب حیات تھے ایک بار آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ درمیان میں آپ حیدرآباد آتے رہے۔ شاید ایک اور بار آپ سے ملاقات رہی۔ ۱۹۹۵ء تا ۱۹۹۸ء شکاگو میں میرے دوست ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی کے پاس میرا آنا جانا ہوا۔ مشاعروں میں آپ کی شرکت کے بارے میں اکثر سنتا رہا۔ فاروقی صاحب کی بدولت وہ ویڈیو کیسٹ بھی دیکھ سکا جس میں آپ شعر پڑھ رہے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ کبھی آپ سے جی بھر کر ملاقات نہ ہو سکی۔

مغنی صاحب کے نام آپ کے خط اور نظم ''تمہارے بعد'' پڑھ کر میں نے اپنے کو آپ سے بہت قریب محسوس کیا۔ گذشتہ اگست میں میری رفیق حیات بھی قلب کے عارضے سے گزر گئیں ''پرسہ'' کہانی ان ہی کی یادوں کی دین ہے۔ اسے آپ تک پہنچا کر میں بھی اپنے غم میں آپ کو شریک کر رہا ہوں۔ میں نہیں جانتا اس سے آپ کو کوئی ریلیف ملے گی کہ نہیں۔ اسی خیال سے کہ آپ کی طرح تنہا ہو جانے والے لوگ بے شمار ہیں۔ یہ غم مشترک ہو کر بھی الگ الگ ہے۔ تمنا ہے کہ آپ کو صبر و سکون عطا ہو۔ اس خط کی رسید بھیج سکیں تو اطمینان ہو جائے گا کہ آپ تک پہنچ گیا ہے۔ آپ کے اور احباب کے لئے نیک تمنائیں!

مونا شہاب (واشنگٹن) ۲۶/نومبر ۲۰۰۲ء

پکار میری ہی پہنچی نہ اس تلک ورنہ
وہ ایسا شخص نہیں تھا کہ مڑ کے نا دیکھے

بہت اچھے حمایت بھائی

آداب!

اپنی پیاری بھابھی کے چلے جانے کی خبر سے دل کو جو صدمہ ہوا وہ بیان سے باہر ہے۔ آپ پر اور آپ کے بچوں پر جو گزری ہوگی اس کا اندازہ لگانا بھی بہت مشکل ہے۔

کوئی طوفان اٹھا ہے مجھ میں
چھن سے کچھ ٹوٹ گیا ہے مجھ میں

میں اور شہاب دیر تک آپ لوگوں کی باتیں کرتے رہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ہم جتنی مرتبہ بھی معراج بھابھی سے ملے ان کی شخصیت کا ایک انتہائی خوشگوار اثر ہم پر رہا۔ تقریباً ایک سال پہلے ہی تو وہ آپ کے ساتھ ہمارے گھر آئی تھیں۔ مجھے تاریخ بھی یاد ہے پہلی جون ۲۰۰۱ء کو، آپ دونوں کا میرے گھر آنا میرے لئے کتنے اعزاز کی بات تھی۔ یہ مجھے معلوم ہے اور پھر بھابھی جیسی پیاری اور شفیق ہستیاں بار بار کہاں ملنی نصیب ہوتی ہیں۔ آپ کا ان کے ساتھ جو طویل سفر کٹا، اس میں آپ دونوں ہی ایک دوسرے کے لئے خوش نصیب ٹھہرے۔ وہ کتنی اچھی شریکِ حیات اور کتنی اچھی ماں تھیں، یہ بات ہم سب ہی جانتے ہیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کئی سال پہلے واشنگٹن میں جعفر رضوی کے ہاں جب میں نے ''ماں'' والی نظم پڑھی تو وہ معراج بھابھی کو بہت پسند آئی اور میں نے کہا بھابھی یہ نظم آج سے آپ کے نام ہے۔ اس چھوٹی سی بات سے ظاہر ہوا کہ ان کو اپنی اولاد کی کتنی چاہت تھی۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ سب کو صبر جمیل عطا فرمائے اور بھابھی کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے آمین

"آسماں تیری لحد پہ شبنم افشانی کرے"

میری اور شہاب کی تمام تر نیک تمنائیں اور دعائیں آپ کے اور پورے خاندان کے ساتھ ہیں اجازت اور خدا حافظ

ڈاکٹر شبیر حیدر (آسٹریلیا) ۲۴/جولائی ۲۰۰۳ء

گرامی قدر حمایت علی شاعر صاحب

آپ کی اہلیہ محترمہ کے انتقال کی خبر سنی۔ بہت ہی دلی افسوس ہوا۔ زندگی کے ساتھی کی ضرورت اس وقت زیادہ شدید ہو جاتی ہے بچے جوان ہو کر اپنے گھروں والے ہو جاتے ہیں اللہ تعالٰی آپ کو صبر دے۔

عزیزی سعید خاں کی کتاب پر آپ کی تحریر بہت خوبصورت اور مشفقانہ دیکھ کر حوصلہ افزائی ہوئی یہاں اشرف شاد صاحب کے تعاون سے شعراء اسٹریلیا کی کتاب چھپی ہے۔ جو انشاء اللہ آپ تک پہنچے گی اور اگر آپ اپنے Kind Words تبصرے کی صورت میں لکھیں تو آسٹریلیا کے شعراء کے لئے حوصلے کی بات ہوگی۔

آپ کی سڈنی اور ہمارے Wollongong کی Visit کی یاد سہانی اور تازہ ہے میرا بیٹا اور جو آپ کا یہاں ڈرائیور تھا۔ آج کل نیویارک میں کام کرتا ہے اور آپ کو بہت یاد کرتا ہے۔ آپ کی صحت اور طویل عمر کے لئے دعا گو ہوں۔

اردو سوسائٹی آف آسٹریلیا آپ کو بہت یاد کرتی ہے۔ ماشاء اللہ شاعروں میں اور لکھنے والوں میں کافی اضافہ ہو رہا ہے۔

غضنفر ہاشمی (راولپنڈی) ۲۴/نومبر۲۰۰۲ء

اوج بھائی!

والدہ صاحبہ کی ناگہانی وفات سے شدید صدمہ اور دکھ کی کیفیت سے دوچار ہوں۔ دکھ کی اس گھڑی میں، میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ خدا تعالیٰ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور آپ کو صبر کی ہمت دے۔

فیروز خسرو (کراچی) یکم، دسمبر۲۰۰۲ء

برادرم اُوجِ کمال

والدہ محترمہ کی رحلتِ پر ہم سب گھر والوں کی طرف سے تعزیت قبول کیجئے۔ ایسے موقع پر لفظ کھوکھلے محسوس ہوتے ہیں اور جملے بے اثر۔ میری والدہ کا انتقال ۱۹۸۵ء میں ہوا تھا اور میں کراچی سے بہت دور رسالپور میں تھا۔ صرف جنازے میں شرکت کر سکا۔ موت برحق ہے۔ آپ سب نے ان کی خدمت بھی کی ان کے قریب بھی رہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ بھی بڑا کرم ہے لیکن جس کو وہ بلاتا ہے وہ خوش نصیب ہے، اسے لبیک کہنا ہی ہوتا ہے۔ اللہ مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور آپ سب کو صبرِ جمیل۔ آمین

اپنے سب گھر والوں کو، روشن خیال اور حمایت بھائی سے بھی ہم سب کی طرف سے تعزیت کر دیجئے گا۔

محمد جان جعفری (کراچی) ۲۴/نومبر۲۰۰۲ء

میرے سوگوار بیٹے اُوجِ کمال

کل اخبار میں دل ہلا دینے والی خبر پڑھی۔ اللہ گواہ ہے کہ ذہن میں وہ مناسب الفاظ

نہیں آرہے ہیں جو ذریت جنت مکانی کے لئے باعثِ تشفی ثابت ہوسکیں۔

حقیقت پسندی کا تقاضہ ہے کہ روایتی لفظ ''صبر'' کی تلقین کرنے کی بجائے میں تمہیں کمال حوصلے کے ساتھ ''جبر'' کرنے کی تلقین کرسکوں۔ حقیقتاً صبر کے حصول کے لئے پہلی منزل جبر ہی کی ہوا کرتی ہے۔

جس بے مثال نعمت سے تم محروم ہوئے، وہیں میرے شاعر بھائی کا بھی تو سوچ اور ذہن کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا ہے۔ نشور واحدی مرحوم کا وہ شعر مجھے بار بار یاد آرہا ہے جو اپنی اہلیہ کے انتقال پر انہوں نے فرمایا تھا کہ ؎

میں تکتا ہوں ہر اک کا منہ بیکسی سے
سہارا نہ چھوٹے کسی کا کسی سے

پروردگار راہیِ ملکِ عدم کو اپنی جوارِ خاص میں جگہ اور جملہ سوگواران کو اس عظیم نقصان کو سہہ لینے کا حوصلہ عطا فرمائے، آمین

مجھے فخر یہ ہے کہ وہ تیری ماں تھی
وہ دریائے اُلفت کا سیلِ رواں تھی
وہ آئی تھی سب پر محبت لٹانے
وہ چاہت، محبت، کرم تھی اماں تھی
وہ پیکر تھی ایثار و صدق و رضا کا
وہ سیرت میں یکتائی کی حکمراں تھی
وہ الفاظ شیریں وہ لہجہ موثر
ہدایت کی بھی وہ کڑی اک کماں تھی

اب کوئی صبح ہے نہ کوئی شام
روشنی ہے نہ تیرگی ہے کہیں
اُس کا غم تھا تو کتنے غم تھے عزیز
وہ نہیں ہے تو آسماں نہ زمیں
ہر طرف ایک ہو کا عالم ہے
سوچتا ہوں کہ میں بھی ہوں کہ نہیں

حمایت علی شاعر

خاندان

(میں اِک اکائی کی مانند ہر عدد میں ہوں)

خاندانی نام	معراج النساء بیگم
عرفیت	جانی بیگم
ادبی نام	معراج نسیم
تاریخ پیدائش	۲۵/دسمبر ۱۹۳۳ء (خاندانی یاداشت)
	۲۵/دسمبر ۱۹۳۶ء (سرکاری)
مقام پیدائش	بھوکردن (اورنگ آباد) مہاراشٹر (انڈیا)
تعلیم	ادیب فاضل، ڈپلومہ (مصوری)
والد کا نام	مولوی عبدالغفور صاحب
پیشہ	تدریس
والدہ کا نام	۱۔ جواہر النساء بیگم
	۲۔ مدینہ بیگم
بہن بھائی	احمدی بیگم، جمیل النساء، منظور احمد
شادی	۱۴/فروری ۱۹۴۹ء
مقام	مغل پورہ (حیدرآباد دکن) آندھرا پردیش (انڈیا)

شوہر کا نام	حمایت علی شاعر
تاریخ پیدائش	۱۴/جولائی ۱۹۳۰ء (خاندانی یاداشت)
	۱۴/جولائی ۱۹۲۶ء (سرکاری)
تعلیم	ایم اے (اردو ادبیات)
پیشہ	تدریس (سندھ یونیورسٹی) ریڈیو، ٹی وی، فلم (نغمہ نگاری، فلم سازی، ہدایت کاری)
اولاد	چار بیٹے، چار بیٹیاں
سسر کا نام	سید تراب علی صاحب
پیشہ	سروس (محکمہ پولیس)
ساس کا نام	۱۔ لطف النساء بیگم
	۲۔ سیدہ حور النساء بیگم
دیور	میر عنایت علی (بی ای۔ سول انجینئر)
	ڈاکٹر مجاہد علی (پی ایچ ڈی۔ ادبیات)
	ڈاکٹر شوکت شعور (پی ایچ ڈی۔ سیاسیات)
	بیرسٹر میر آصف علی (ایل ایل ایم)
نندیں	فرزانہ لیاقت علی (ایم ایس سی، بیالوجی۔ بی ایڈ)
	شاہین اقبال (ایم اے۔ انگریزی ادبیات)

بیٹے اور بہوئیں ۱۔کمانڈر روشن خیال (پاکستان نیوی)

(ایم اے، ادبیات۔ ایم اے، صحافت)

ثمینہ روشن خیال

(ایم ایس سی، مائیکرو بیالوجی۔ ریسرچ اسکالر)

۲۔اُوج کمال (لیکچرار، شعبہ ابلاغ عامہ، اردو یونیورسٹی)

ریسرچ اسکالر

مدیر اعزازی، ماہنامہ ''دنیائے ادب'' کراچی

(ایم اے، ابلاغ عامہ۔ ایم اے، بین الاقوامی تعلقات)

ڈپلومہ (مکینکل انجینئرنگ)

تسنیم کمال (لیکچرار، سیاسیات، لیاقت گورنمنٹ گرلز کالج)

(ایم اے، سیاسیات۔ بی ایڈ۔ ریسرچ اسکالر)

۳۔ذوالجمال (فلائٹ آپریشن آفیسر) مقیم ٹورانٹو (کینیڈا)

(ایم ایس سی۔ ریاضی) کراچی

ڈاکٹر فرحین جمال

(ایم بی بی ایس) حیدرآباد (سندھ)

۴۔ڈاکٹر بلند اقبال۔ مقیم وینی پیگ۔ مینی ٹوبا (کینیڈا)

(ایم ڈی۔ اے بی آئی ایم۔ امریکہ)

شجیعہ اقبال

(ایم ایس سی۔ زولوجی۔ ایم اے۔ اردو)

بیٹیاں اور داماد ۱۔ جاوداں میر (پروفیسر۔ خورشید گورنمنٹ گرلز کالج کراچی)

(ایم اے۔ اسلامیات، عربی لینگوتج کورس۔ ریسرچ اسکالر)

محمد انورالدین صدیقی (براڈ کاسٹ انجینئر)

(بی ایس سی۔ اے ایم آئی ای۔ الیکٹریکل)

(ایم اے۔ صحافت)

۲۔ فروزاں علی (پروفیسر، اردو یونیورسٹی کراچی)

(ایم اے، سیاسیات۔ بی ایڈ۔ ایل ایل بی)

(ریسرچ اسکالر) مقیم۔ ٹورانٹو (کینیڈا)

سید مسعود احمد رضوی (ریفریجریشن، مکینیکل انجینئر)

(اے ایم آئی ای۔ مکینکل)

(ڈپلومہ، ریفریجریشن۔ بی اے) مقیم۔ ٹورانٹو (کینیڈا)

۳۔ غزالاں حمایت (لیکچرار۔ خورشید گورنمنٹ گرلز کالج)

(ایم اے، تعلیم۔ ایم ایڈ۔ ریسرچ اسکالر)

شفیق الزماں (بینکار۔ نگراں و مرتب مجلّہ ''شخصیت'')

(بی کام)

۴۔ ڈاکٹر زرافشاں سید۔ مقیم کلیولینڈ۔ اوہایو (امریکہ)
(ایم بی بی ایس) کراچی
ڈاکٹر وسیم خان
(ایم ڈی۔ ڈی اے بی پی۔ ایف اے اے پی۔ امریکہ)

پوتے، پوتیاں ○ پوتا۔ طلال روشن (طالب علم یونیورسٹی) مقیم ٹورانٹو (کینیڈا)
پوتی۔ فریال روشن (طالبہ اسکول) مقیم ٹورانٹو (کینیڈا)
○ پوتی۔ شاداب کمال (طالبہ اسکول)
پوتی۔ ہانی کمال (طالبہ اسکول)
پوتی۔ نیہا کمال
پوتا۔ عارج کمال
○ پوتی۔ کورین جمال (مقیم ٹورنٹو، کینیڈا)

نواسے، نواسیاں ○ نواسی۔ ڈاکٹر عینی شگفتہ (ایم بی بی ایس) کراچی
نواس داماد۔ ڈاکٹر محمد محی الدین
(ایم ڈی) مقیم نیویارک (امریکہ)
نواسی۔ کرن الماس (ایم ایس سی، مائیکروبیالوجی)
نواس داماد۔ احسان علی خان (ایم ایس۔ امریکہ) بی۔ ای (کراچی)
نواسی کی بیٹی۔ کومل خان (نومولود) مقیم وینی پیگ (کینیڈا)

نواسہ۔ محمد علی الدین خرم (طالب علم یونیورسٹی۔ بی ایس)

نواسہ۔ محمد عدیل الدین (طالب علم کالج)

o نواسہ۔ ڈاکٹر سید فراز مسعود رضوی۔ مقیم ٹورانٹو (کینیڈا)

(ایم بی بی ایس۔ کراچی)

نواسی بینا مسعود رضوی (بی ایس۔ واٹرلو یونیورسٹی۔ کینیڈا)

نواسی۔ ثناء مسعود رضوی (طالبہ ہائی اسکول۔ ٹورانٹو)

نواسہ۔ سید فواز مسعود رضوی (طالب علم اسکول۔ ٹورانٹو)

o نواسہ۔ ساحر شفیق (طالب علم، یونیورسٹی۔ کراچی)

نواسہ۔ آذر شفیق (طالب علم اسکول۔ کراچی)

o نواسی۔ زویا خان وسیم (طالبہ۔ کلیولینڈ، امریکہ)

نواسی۔ سارا بانو وسیم (مقیم امریکہ)

o

بس ایک کام کیا ''ہم'' نے زندگی بھر میں

تمام بچے ہیں تعلیم یافتہ گھر میں

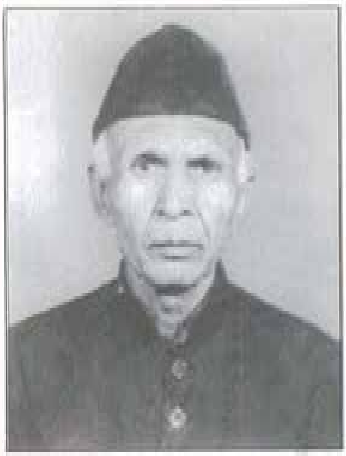

سید تراب علی صاحب

مولوی عبدالغفور صاحب

(لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو)

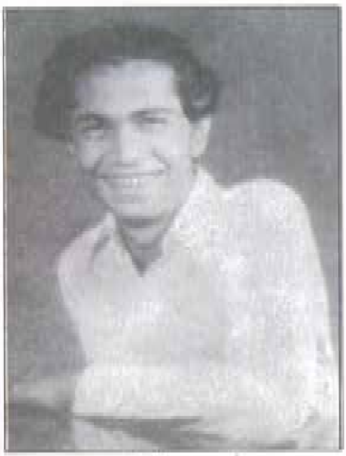

حمایت علی شاعر

(1948)

معراج نسیم

(1951)

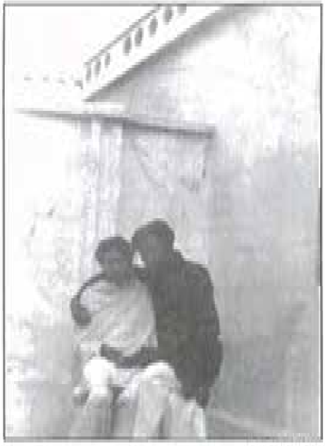

(1949)

(1950)

(1952)

(1954)

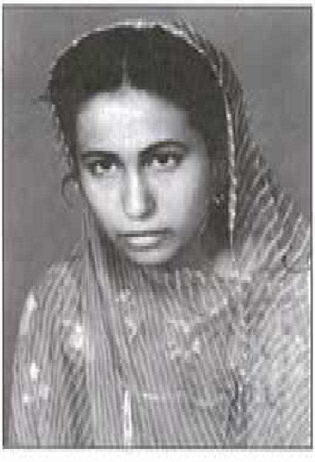

(1955)

(1965)

(1951)

تین تصویریں ..... تین دور

(1990)

اورنگ آباد دکن ٥ معراج نسیم اپنی ساس حورالنساء بیگم، دیورانی بیگم عنایت علی اور نند شاہین اقبال کے ساتھ

اورنگ آباد ٥ معراج نسیم، بیگم عنایت علی اور بیگم مجاہد علی کے ساتھ

اورنگ آباد ○ گڑیا (زرافشاں سید) اپنی دادی نورالنساء بیگم کے ساتھ

اورنگ آباد ○ معراج نسیم اپنی نندوں فرزانہ لیاقت علی، شاہین اقبال اور چچازاد نند ریحانہ کے ساتھ

اورنگ آباد ○ معراج نسیم اپنے دیور مجاہد علی اور عنایت علی کے بچوں نشید، افشاں (گود میں) فہد کے ساتھ

اورنگ آباد ○ حمایت علی شاعر اپنے آبائی گھر ''مونا بلڈنگ'' میں اپنے بھائیوں مجاہد علی، عنایت علی
شوکت علی شعور اور آصف علی کے ساتھ

اورنگ آباد ○ معراج نسیم اپنی چھوٹی بہن بیگم نواب اکبر کے ساتھ

حمایت علی شاعر، پھوپھی شہزاد کبیر، معراج نسیم اور قمر دستگیر (گوری خالہ)

کراچی ○ غلام دستگیر، حمایت علی شاعر، جاوداں، قاضی شفیع الدین فرقت، خواجہ معین الدین اور خواجہ نصیر الدین

اورنگ آباد ○ معراج نسیم، شاہین رئیس، حمایت علی شاعر اور قاضی رئیس (قمر بھائی)

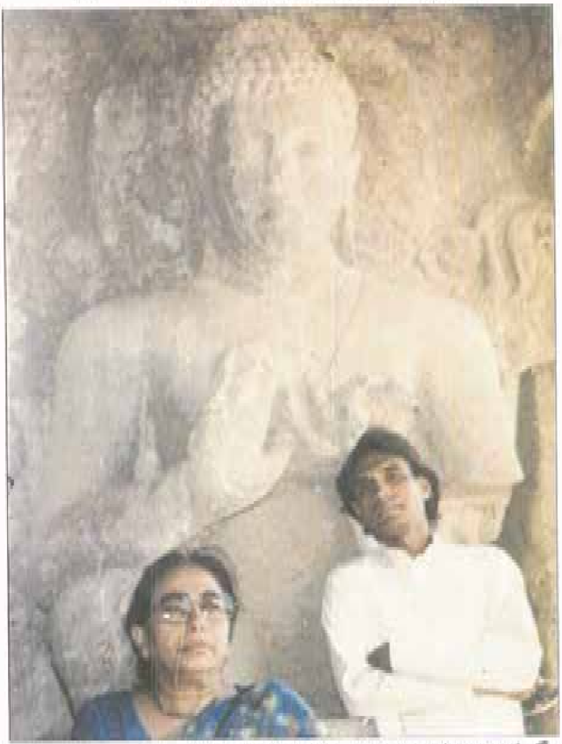

اورنگ آباد ○ (ایلورہ کے غار میں) معراج نسیم اور مجاہد علی مہاتما بدھ کے مجسمے کے ساتھ

کراچی ○ مسلم ضیائی، معراج نسیم اور روشن خیال

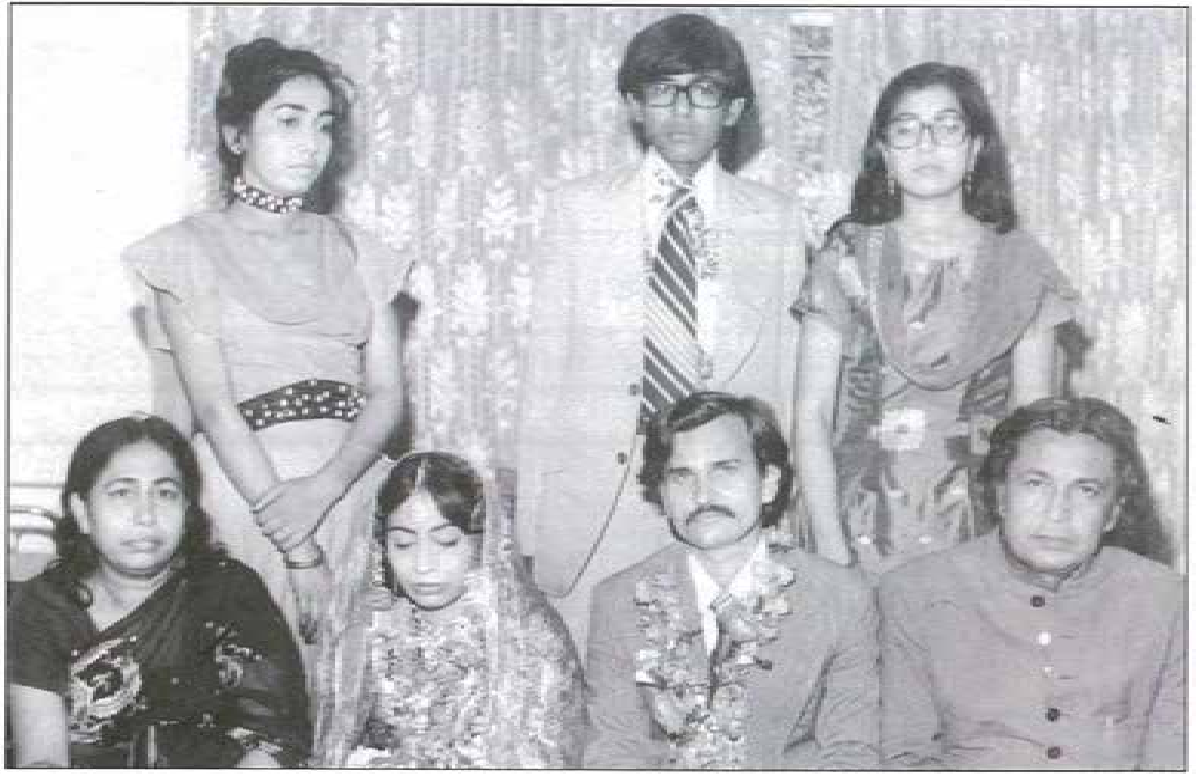

کراچی ○ (جاوداں کی شادی کے موقع پر) غزالاں (مونا) اوج کمال، فریدوں علی، حمایت علی شاعر، نورالدین صدیقی، جاوداں میر اور معراج نسیم

کراچی ○ روشن خیال اپنی منگنی کے موقع پر اپنے والد حمایت علی شاعر اور والدہ معراج نسیم کے ساتھ

کراچی ○ بدر النساء، معراج نسیم، روشن خیال کی دلہن ثمینہ عزیز اور بیگم اشرف الدین

کراچی ٥ روشن خیال اپنی دلہن ثمینہ، سسر سید شاہ عزیز الدین اور ساس عظمت جہاں صاحبہ کے ساتھ

کراچی ٥ (روشن خیال کی شادی کے موقع پر) سید شاہ نعیم الدین، حمایت علی شاعر، روشن خیال، معراج نسیم
ثمینہ عزیز، والدہ نعیم الدین اور بے بی کنول

کراچی ○ فروزاں علی اور سید مسعود احمد رضوی

کراچی ○ (فروزاں کی شادی کے موقع پر) روشن خیال، انورالدین، جاوداں، بلند اقبال، فروزاں
اوج کمال، بیگم منصور، مسعود احمد رضوی اوران کی والدہ، فروزاں علی، معراج نسیم اور میر عنایت علی

کراچی ○ (غزالاں کی شادی) حمایت علی شاعر، گود میں فراز، شفیق الزماں، غزالاں حمایت اور معراج نسیم

کراچی ○ بیگم حفیظ الدین، دلہن غزالاں اور معراج نسیم

کراچی ○ (اوج کمال کی شادی کے موقع پر) منظور احمد، حمایت علی شاعر، اوج کمال، تسنیم ہاجرہ، معراج نسیم اور حمیدہ بیگم

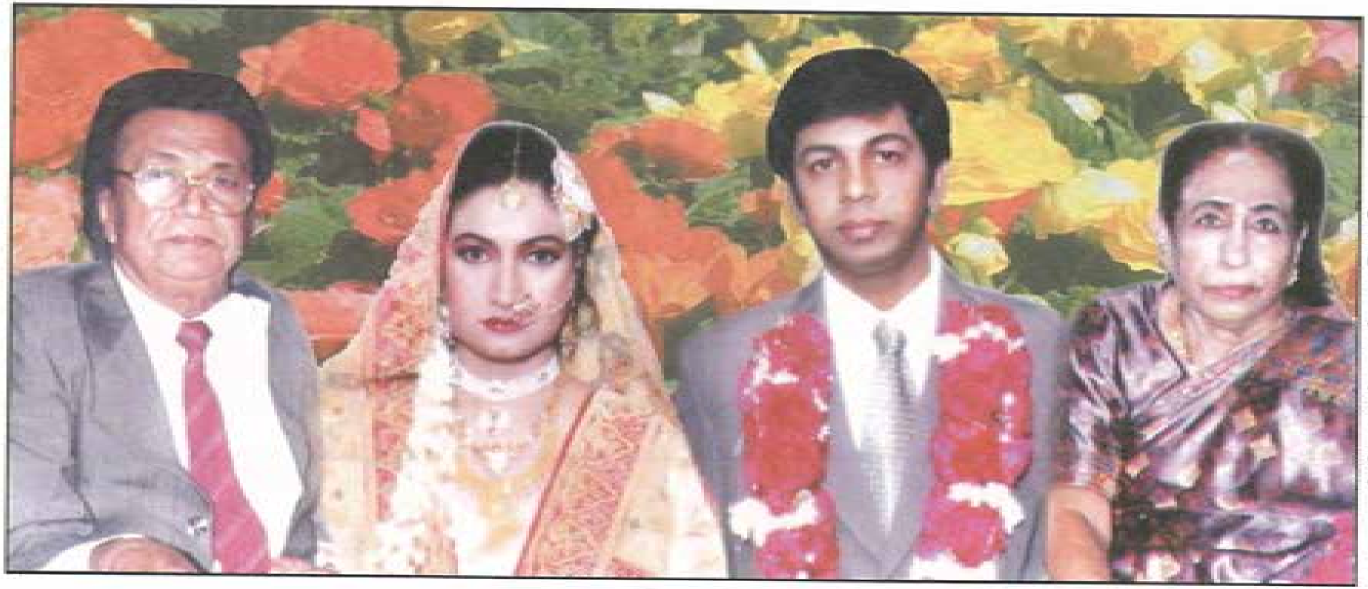

حیدرآباد (سندھ) ○ (ذوالجمال کی شادی کے موقع پر) ذوالجمال اپنی دلہن فرحین محمود، والد حمایت علی شاعر
اور اپنی والدہ معراج نسیم کے ساتھ

حیدرآباد (سندھ) o معراج نسیم اپنی بہو فرحین جمال کو گلے لگائے ہوئے

حیدرآباد (سندھ) o حمایت علی شاعر اور معراج نسیم اپنی بہوؤں نجیبہ اقبال اور فرحین جمال کے ساتھ

حیدرآباد (سندھ) ০ (بلند اقبال کی شادی کے موقع پر) بیگم ممتاز محمود، نجیبہ محمود، بلند اقبال اور معراج نسیم

کراچی ০ طلال، تسنیم، فراز، عدیل، خرم، ذوالجمال، فرحین، فریال، کرن، شاداب، عینی، غزالاں
روشن خیال، ثمینہ، رعنا اقبال، اُورج کمال، معراج نسیم، نجیبہ، بلند اقبال، حمایت علی شاعر اور جاوداں

کراچی ٥ (زرافشاں کی منگنی کے موقع پر) وسیم کی بہنیں، گڑیا اور نیلوفر، وسیم کی والدہ محترمہ زرافشاں
وسیم خان، معراج نسیم اور حمیدہ بیگم

کراچی ٥ عرفی، ساحر، شفیق الزماں، غزالاں، جاوداں، خرم، فراز، کرن، بینی، بیبا، روشن خیال، بلند اقبال
ذوالجمال، ہانی، اوج کمال، شاداب، تسنیم، حمیدہ بیگم، بیگم حفیظ، معراج نسیم، زرافشاں، حمایت علی شاعر
حفیظ الدین، ثمینہ، منظور احمد، طلال، عدیل، فریال اور آذر

کراچی ٥ (مایوں کی رسم) دلہن زرافشاں اپنی امی معراج نسیم اور بھابھی ثمینہ روشن کے ساتھ

کراچی ٥ (زرافشاں کی شادی کے موقع پر) اشرف الدین صاحب، زرافشاں، وسیم خان
حمایت علی شاعر اور معراج نسیم

کراچی ○ (بینی کی شادی) خرم، کرن، عدیل، معراج نسیم، بینی شگفتہ، محمد محی الدین اور حمایت علی شاعر

کراچی ○ فریدہ، کرن احسان، جاوداں مہر، معراج نسیم، نعیمہ سلطانہ، بینی شگفتہ، محمد محی الدین
حمایت علی شاعر، انور الدین اور زر افشاں سید

کراچی o (کرن کی شادی کے موقع پر) بیگم خورشید علی خان، کرن الماس، احسان علی خان، سیف رضی اور
پروفیسر ڈاکٹر خورشید علی خان

کراچی o آزر، حمایت علی شاعر، بیٹی شگفتہ، فراز، خرم، ساحر، اوج کمال، عدیل، حمیدہ بیگم، تسلیم کمال، ہانی
کرن، معراج نسیم اور فرحین جمال

کراچی ○ بینا مسعود، معراج نسیم، احسان علی خاں (نہال) عدیل اور جاوداں میر

کراچی ○ (ثمینی کی شادی) فراز، جاوداں، انور، بلند اقبال، خرم، بینا، کرن، غزالاں، ساحر، شاہ، مسعود رضوی
ثمینہ، روشن خیال، طلال، تسنیم، فروزاں، معراج نسیم، ثمینی، محمد محی الدین، حمایت علی شاعر، زویا، زر افشاں
فریال، ہانی، آزر، شاداب اور فواز

کراچی ○ تسنیم کمال اور اوج کمال، شجیعہ اقبال اور ڈاکٹر بلند اقبال، ڈاکٹر فرحین جمال اور رضوان جمال، ثمینہ روشن اور کمانڈر روشن خیال

کراچی ○ (تبسم کی منگنی) سرور احمد، تسنیم، مسرور احمد، معراج نسیم، تبسم اور منظور احمد

کراچی ○ حمایت علی شاعر، فراز، بیگم آذر نوید، معراج نسیم، بیگم قاضی شفیع، آذر نوید (جاوید) اور ان کے بچے

کراچی ○ (گہوارہ) نجیبہ محمود، پروفیسر محمود علی رضوی، حمایت علی شاعر، گود میں ہانی، معراج نسیم اور بیگم محمود

کراچی ○ (گہوارہ) تسلیم، خواجہ نصیر الدین، حمیدہ بیگم، معراج نسیم، بلند اقبال، حمایت علی شاعر، آذر، غزالاں
بیگم قاضی شفیع اور بیگم خواجہ نصیر الدین

نیویارک ○ (ماؤنٹ ورنن ہسپتال کے سامنے) ڈاکٹر بلند اقبال، حمایت علی شاعر اور معراج نسیم

نیویارک ○ معراج نسیم اپنے بیٹوں ذوالجمال اور بلند اقبال کے ساتھ

نیویارک ٥ (بلند کا گھر) بلند اقبال اپنی امی کے زانوں پر سر رکھے ہوئے

کراچی ٥ (گہوارہ) معراج نسیم کی گود میں ہانی (پوتی) اور فراز (نواسہ) زانوں پر سر رکھے ہوئے

کراچی ○ معراج نسیم کے ساتھ بڑے داماد انوار الدین، جاوداں میر، ٹینی، کرن، گڑیا اور بینا

کراچی ○ حمایت علی شاعر اور معراج نسیم اپنی پوتیوں شاداب، ہانی، نیہا اور فیری (فریال) کے ساتھ

کلیولینڈ (امریکہ) ○ معراج نسیم اپنی نواسیوں زویا اور سارا کے ساتھ

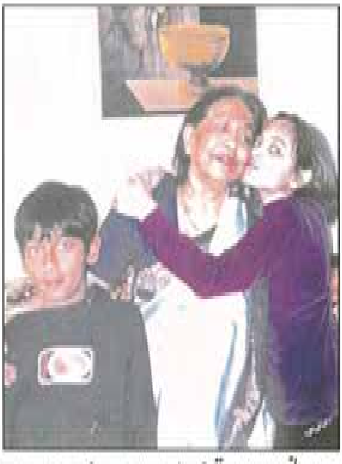

معراج نسیم اپنی پوتی فریال اور نواسے فواز کے ساتھ

معراج نسیم اپنی نواسی ثناء مسعود کے ساتھ

کراچی ٥ (مجلّہ ''شخصیت'' کی رونمائی کے موقع پر) شفیق الزماں، جمیل الدین عالی، ڈاکٹر عالیہ امام
معراج نسیم اور حمایت علی شاعر

کراچی ٥ شفیق الزماں، ذوالجمال، ثمینی، کرن، ریحا خرم، اوج کمال، فراز، ساحر، بلند اقبال، غزالاں
زرافشاں، عدیل، شاہ، آزر، طلال، ثمینہ، بیگم سہیل، فواز، فروزاں، خواجہ معین الدین، بیگم معین الدین
معراج نسیم، حمایت علی شاعر اور جاوداں میر

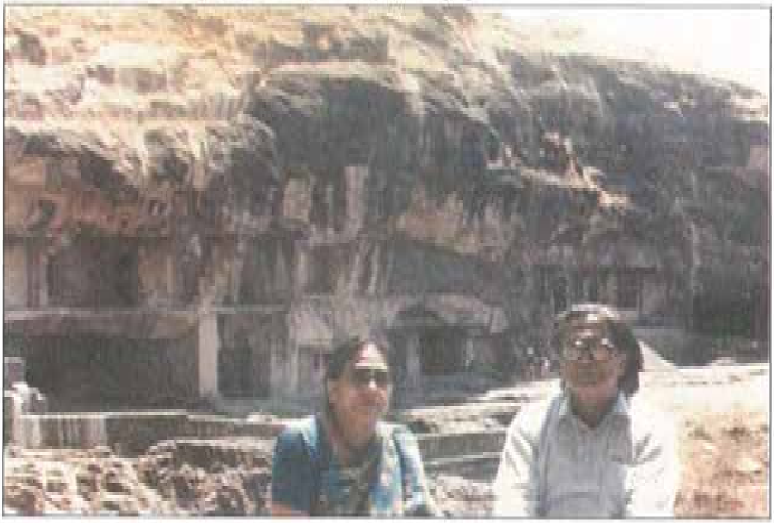

اورنگ آباد ○ (ایلورہ کے غاروں کے سامنے) حمایت علی شاعر اور معراج نسیم

واشنگٹن ○ حمایت علی شاعر اور معراج نسیم وائٹ ہاؤس کے سامنے

واشنگٹن ○ (میوزیم) معراج نسیم اور حمایت علی شاعر خلانورد، نیل آرم اسٹرانگ کی چاند پر تصویر کے ساتھ

نیویارک ○ (امپائر بلڈنگ) حمایت علی شاعر اور معراج نسیم سب سے اوپر کی منزل پر

کولبس (اوہائیو) ○ (جشن جگن ناتھ آزاد کے موقع پر) شاہدہ نسیم سالک، معراج نسیم، حمایت علی شاعر
نظر باقری، جگن ناتھ آزاد اور فرحانہ جوہی

کراچی ○ (حمایت علی شاعر کے ساتھ ایک شام) جسٹس مہدی علی صدیقی، پروفیسر کرار حسین، معراج نسیم
حمایت علی شاعر، حمید قریشی اور رشید شکیب

شکاگو ○ (ڈاکٹر فاروقی کے مکان پر) رضی اختر شوق، جگن ناتھ آزاد، ڈاکٹر مظفر الدین فاروقی،
حمایت علی شاعر، نجم الدین، ڈاکٹر نیساں، معراج نسیم اور بیگم بلقیس فاروقی

نیویارک ○ (وکیل انصاری کے گھر پر) دریں یلین، معراج نسیم، حمایت علی شاعر، وکیل انصاری، حلیف اظفر
یلین زبیری، عزیز الحسن، ڈاکٹر سرور اور بیگم فرح وکیل

کراچی ○ حمایت علی شاعر، معراج نسیم، وزریں، ہلین، جمیل الدین عالی اور بیگم عالی

کراچی ○ (آرٹس کونسل) معراج نسیم، حمایت علی شاعر، ڈاکٹر رفیق جان اور ان کی بیگم

کراچی ○ (گہوارہ) امی اور ڈیڈی کے ساتھ بلند اقبال، روشن خیال، اوج کمال اور ذوالجمال

کراچی ○ (ڈیڈی کی لائبریری) معراج نسیم، بانو ارشد، عمران الارشد اور حمایت علی شاعر

کراچی ٥ ('' گہوارہ '' کے ڈرائنگ روم میں) ایوارڈز کے ساتھ حمایت علی شاعر اور معراج نسیم

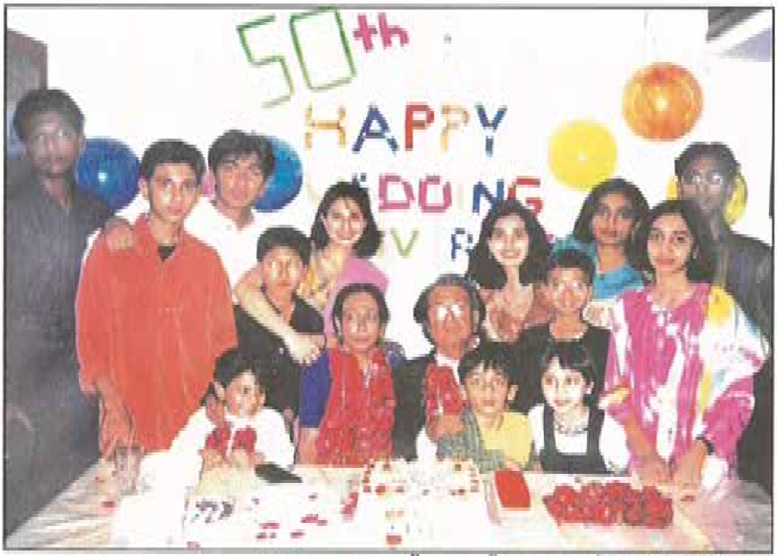

کراچی ٥ (شادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر) علی الدین خرم ، شاہ مسعود ، بینا مسعود ، فریال ، عدیل
فواز کرن ، حمایت علی شاعر ، معراج نسیم ، بیٹی شگفتہ ، آذر ، شاداب ، فراز ، طلال ، اور ساحر

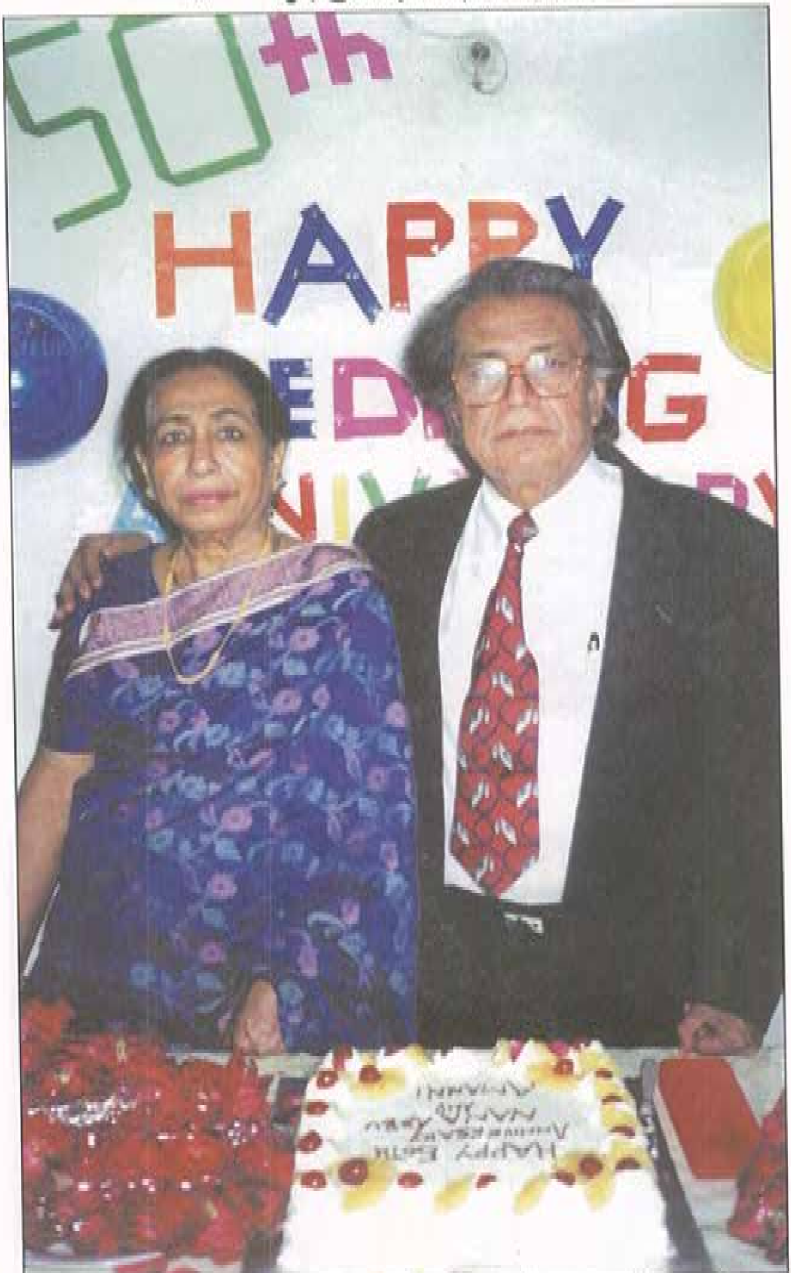

کراچی ٥ (گہوارہ) حمایت علی شاعر اور معراج نسیم اپنی شادی کی پچاسویں سالگرہ کے موقع پر

اک قبر کا نشاں، متاعِ حیات ہے

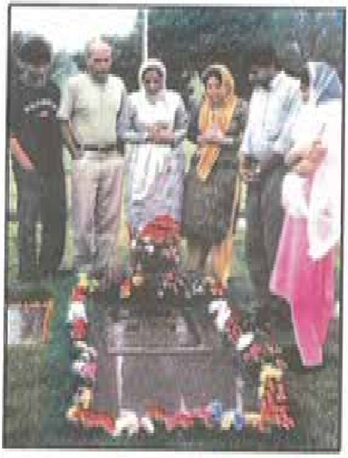

(قبرستان، پکرنگ، ٹورانٹو)

ہم سفر

پروفیسر جاوداں میر

میری امی

اپنی امی اور ڈیڈی کی میں سب سے بڑی بیٹی ہوں اس لئے مجھے سب سے زیادہ ان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ وہ مجھ سے صرف سترہ سال بڑی تھیں۔ میں جب ہائی اسکول میں تھی تو اکثر لوگ مجھے ان کی چھوٹی بہن سمجھتے تھے۔ میرے ڈیڈی چونکہ شاعر ہیں اس لئے ان کی دنیا ہی اور تھی وہ میری امی کو ہمیشہ خوب سے خوب تر دیکھنا چاہتے تھے اور امی بھی ان کی پسند کا خیال رکھتی تھیں۔ ڈیڈی کا ایک شعر ہے جو دونوں کے انداز زندگی کا ائینہ دکھاتا ہے ؎

وہ اپنی سج دھج میں اپنے ذوق جمال کا آئینہ ہے لیکن
میں اس کی آرائشوں میں اپنی نگاہ کا التزام دیکھوں

ڈیڈی جب پاکستان آئے اور پھر امی کو بھی بلا لیا اور پھر یہاں کراچی میں چار پانچ سال جس طرح ان کی زندگی گزری اس کا تو مجھے کوئی اندازہ نہیں۔ میں بہت چھوٹی تھی اس لئے میری یادداشت اس مصرعے کے مصداق ہے

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا

امی کے انتقال کے بعد جب میں نے ڈیڈی کی خواہش پر تسنیم (اوج کمال کی بیوی) اور مونا (غزالاں شفیق) کے ساتھ امی کی تمام چیزوں کا جائزہ لیا تو ان کے کاغذات میں مجھے ڈیڈی کی کچھ ایسی تحریریں ملیں جو انہیں یاد بھی نہیں تھیں۔ مثلاً ان کے بعض خطوط اور نظمیں (یہ نظمیں کہیں شائع نہیں ہوئی تھیں) ڈیڈی کی اکثر نظمیں اس بات کی گواہی دیتی ہیں کہ انہیں ہماری امی سے کتنی

محبت تھی'' آگ میں پھول'' کی بعض نظموں میں تو امی کا '' نام'' بھی آ گیا ہے ۔

دل نے چپکے سے کہا شاعر آوارہ مزاج
تیری بے نام تمنا کی یہی ہے معراج
انہیں قدموں جھکا دے سر مغرور اپنا
یہی خاک کف پا ہے ترے ہر غم کا علاج

یا

وہ حسیں خواب کہ ہے میرے ہر اک غم کا علاج
میرا حاصل، مری خاموش وفا کی معراج
(آگ میں پھول)

یہ تو خیر ان کی ابتدائی نظموں کے اشعار ہیں ۔ امی کے انتقال کے بعد ڈیڈی نے جو نظمیں لکھیں ان میں ایک نظم کا بند ہے ۔

معراج، وہ اک نام، بلندی کی علامت
جس نام نے مجھ خاک نشیں کو کیا اعلیٰ
جو شمع کے مانند فروزاں رہا مجھ میں
جس نے مجھے مایوس اندھیروں سے نکالا
اک منزل بے نام کی جانب تھا رواں میں
نام اس کا رکھا اس نے محبت کا شوالہ

امی سے متعلق کئی نظمیں ان کی کتابوں میں محفوظ ہیں ۔'' آگ میں پھول'' چونکہ پہلا مجموعہ ہے اس لئے اس میں شادی سے پہلے کا کلام بھی ہے اور بعد کا بھی ..... ان کی بعض نظمیں ان کی ازدواجی زندگی کا بھی آئینہ دکھاتی ہیں حالانکہ اردو کے شعرائے کرام ایسے موضوعات سے

اکثر گریز کرتے ہیں۔ خدا جانے کیوں ہماری شاعری حقیقتوں سے اجتناب برتتی رہی ہے۔ زیادہ تر تصوراتی اور خیالی باتیں شاعری میں ملتی ہیں۔ سوائے میر انیس کے مرثیوں کے انسانی زندگی کے معاشرتی رشتوں کا احوال کہیں نہیں ملتا۔

علامہ اقبال پہلے شاعر ہیں جنہوں نے اپنی والدہ مرحومہ پر بھی بہت ہی طویل اور اعلیٰ ترین نظم لکھی (بانگ درا) اور اپنی مختلف کتابوں میں اپنے بیٹے جاوید اقبال سے بھی مسلسل مخاطب رہے ہیں مگر اتنے بڑے انقلابی شاعر ہونے کے باوجود وہ بھی بعض نظموں میں حقیقت سے کتراتے نظر آتے ہیں۔ ''بانگ درا'' ہی میں ان کی ایک نظم کا عنوان ہے'' ..... کی گود میں بلی دیکھ کر'' وہ کوئی فرضی نام بھی نہ رکھ سکے۔ یہ جرأت پہلی بار اختر شیرانی نے کی ہے۔ وہ ''سلمہ'' کے فرضی نام سے مسلسل ''کسی سے'' اپنے دل کا حال کہتے رہے ہیں، ترقی پسند شعرا میں البتہ جان نثار اختر، کیفی آعظمی اور علی سردار جعفری نے نہ صرف اپنی بیویوں کے نام لئے ہیں بلکہ مختلف نظمیں بھی ان پر لکھی ہیں۔

میرے ڈیڈی نے بھی اپنی شاعری میں حقیقت بیانی سے کام لیا ہے۔ انہوں نے امی کے علاوہ اپنے بچوں پر بھی نظمیں لکھی ہیں۔ ادھوری کہانی، وہ، تیری باتیں تیرے خواب، غمِ حاصل، جبر عہد، وحشت بام ودر، کھلونے، مژدۂ نو، غم فردا، چل خسرو گھر اپنے اور جاوداں ..... ''آگ میں پھول'' کی یہ تمام نظمیں ان کی فیملی لائف کی ترجمان ہیں، ان میں طویل نظمیں بھی ہیں اور مختصر بھی۔ مجھ پر بھی ڈیڈی نے ایک طویل نظم لکھی ہے جس میں پہلی بار باپ کی محبت سے آشنا ہونے کی کیفیت کا اظہار ہے اور بحیثیت ''باپ'' اپنے تصورات کا ..... میں صرف آخری بند لکھتی ہوں جس سے ان کے طرز فکر کا اندازہ ہو جائے گا ۔

یہ ننھی سی شمع جس کی لو میں ابھی کوئی روشنی نہیں ہے
نظر کا حسنِ فریب دیکھو، ابھی سے میری نظر کہیں ہے

میں اس کے چہرے میں اپنے خوابوں کا حسن تعبیر دیکھتا ہوں
میں اپنے فردا کے آنکھ اوجھل افق کی تنویر دیکھتا ہوں
میں دیکھتا ہوں کہ میں تناسخ کے اک عمل سے گزر رہا ہوں
میں اپنے انجام تک پہنچ کر پھر اپنا آغاز کر رہا ہوں
مری شریک حیات اور میں، جو دو تھے، اب ایک ہو گئے ہیں
ہمارے عہد وفا کے لمحات آج سب ایک ہو گئے ہیں
نئے خدوخال سے ہمارے جسد کی تشکیل ہو رہی ہے
ادھورا پن ختم ہو رہا ہے، ہماری تکمیل ہو رہی ہے

یہ نظم ڈیڈی نے ۵۳ء میں لکھی تھی جب میری عمر سال یا دو سال کی تھی۔

ہر لڑکی شادی سے پہلے کچھ خواب دیکھتی ہے۔اس کا نصیب ایک انجانی دنیا سے وابستہ ہوتا ہے۔اس لئے وہ اس دنیا کو خوبصورت دیکھنا چاہتی ہے۔ڈیڈی کی شاعری، اپنے تصورات کے ساتھ اپنی زندگی کا بھی آئینہ دکھاتی ہے، میں سوچتی ہوں، میری امی ان نظموں کو پڑھ کر کس طرح اپنے خوابوں سے نکلی ہوں گی؟ ڈیڈی کی شاعری سے اس عہد کی جو تصویر ابھرتی ہے اس کی روشنی میں امی کا کردار بھی نمایاں ہوتا ہے حالانکہ امی ایک کم عمر لڑکی تھیں۔ ان کی شادی ۱۴/ فروری ۱۹۴۹ء کو ہوئی تھی۔انہیں لکھنے پڑھنے کا بہت شوق تھا، وہ افسانے بھی لکھتی تھیں اور بچوں کے لئے چھوٹے چھوٹے مضامین اور کہانیاں بھی، مسلم ضیائی صاحب کے رسالے ''تارے'' میں وہ شادی کے بعد تک لکھتی رہیں۔شادی کے بعد وہ ایک ہفتہ وار رسالے ''پرواز'' کے صفحۂ خواتین کی انچارج بھی رہیں۔ڈیڈی اس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد میں کام کرتے تھے مگر ۵۰ء کے آخر میں ان کی نوکری چھوٹ گئی اور وہ روزگار کی تلاش میں بمبئی چلے گئے اور ۵۱ء کے دوران پاکستان آگئے۔ یہاں وہ جن حالات سے دوچار ہوئے اس کا احوال ان کے

مختلف مضامین ''آگ میں پھول'' کی نظموں اور ان کی منظوم سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' میں تفصیل سے ملتا ہے۔ اس کتاب میں امی کے بارے میں بھی بہت سی تفصیلات ہیں۔ امی کے کاغذات میں ڈیڈی کا ایک منظوم خط ہے جو ۵۲ء میں انہوں نے کراچی سے لکھا تھا۔ اس خط کو پڑھ کر میں سوچتی ہوں کہ امی نے کیا سوچا ہوگا؟

تمہارا خط مل گیا ہے معراج
پڑھ کے بے حد خوشی ہوئی ہے
کہ میری ننھی سی بیٹی اب پاؤں چل رہی ہے
کہ میری بیٹی، ادھورے فقروں میں یاد کرنے لگی ہے مجھ کو
وہ صبح ہی اٹھتے ہی ریڈیو کو تھپکنے لگتی ہے
''ابا، ابا'' پکارتی ہے
وہ یہ سمجھتی ہے، بند ہیں ریڈیو میں اس کے ''حضور ابا''
وہ کس قدر عقلمند ہے، کتنی نکتہ رس ہے
میں آج ان ننھے ننھے قدموں، ادھورے فقروں سے دور
اک اجنبی زمیں پر
خدا کی آزاد مملکت میں
بہ فیض افلاس، اپنی ویران خلوتوں کو سمیٹے
آوارہ پھر رہا ہوں
مری نگاہوں میں دور تک زندگی کا سیلاب ابل رہا ہے
ہزاروں نقشے سنور رہے ہیں
ہزاروں نقشے بکھر رہے ہیں

ہزاروں آنکھیں کہ جس طرح آئینے چمکتے ہوں روشنی میں
ہزاروں آنکھیں کہ جس طرح قبر پر سرِشام اونگھتی سی اداس شمعیں
ہزار ہا ہونٹ ..... قہقہوں مسکراہٹوں کی تجوریاں ہیں
ہزار ہا ہونٹ ..... گندے پانی کی نالیاں ہیں
وہ مسکرائیں تو برق سی کوند کوند جائے
یہ مسکرائیں تو جیسے کوئی ستارہ ٹوٹے
تو فضا میں گھل جائے چاندنی سی
یہ ہنس پڑیں تو غلیظ پانی میں بلبلے پھوٹ پڑے ہو جیسے
وہ بات کرنے لگیں تو غنچوں کو گدگدی ہو، چمن میں کلیاں سی مسکرائیں
یہ بات جب بھی کریں تو الفاظ، دل کا آئینہ بن نہ پائیں، لبوں تک آ آ کے ٹوٹ جائیں

میں آج اپنے شکستہ لفظوں کو جوڑ کر
ایک نظم کہنے لگا ہوں ..... دیکھو
وہ نظم ہوئی ہے یا کوئی مرثیہ ہمارا
تم اس کو پڑھ لو
مگر اسے پھاڑ دو خدارا

مگر امی نے اسے پھاڑا نہیں۔ پچاس سال محفوظ رکھا۔ میں سوچتی ہوں، پاکستان آنے سے پہلے امی کا ذہن کیا کچھ سوچنے لگا ہوگا۔ انہوں نے اس نظم کی روشنی میں اپنے مستقبل کی کوئی بھیانک تصویر بھی دیکھی ہوگی اور اسے اپنا مقدر سمجھ کر خود کو آمادہ بھی کیا ہوگا۔ اک اجنبی سرزمیں پر ..... ماں باپ، عزیز و اقارب سے دور ..... اپنے شوہر کے ساتھ ..... تنہا ..... کیسی

بیچارگی کا عالم ہوگا ..... مگر یہ تو ہر لڑکی کی تقدیر ہوتی ہے۔

امی پاکستان آگئیں اور ایک جھونپڑی میں زندگی گزارنے لگیں۔ یہ جھونپڑیاں قائد اعظم کے مزار کے اطراف بہت دور حیدر آباد کالونی کے پاس، جھیل تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس وقت قائد کا مقبرہ بھی نہیں بنا تھا۔ ۵۲ء میں ڈیڈی نے مزار قائد پر ایک نظم بھی لکھی تھی جس کا ایک شعر ان کے محسوسات کا ترجمان ہے۔

ذرا نگاہ اٹھا کر یہ زندگی تو دیکھ
ترا مزار، مزاروں کے بیچ ہے کہ نہیں

ڈیڈی اس زمانے میں بڑی تلخ نظمیں لکھتے تھے۔ ان کی ایک نظم ''مہاجر بستیاں'' اس سلسلے میں خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس کے ایک دو شعر پڑھ لیجئے۔

صبح ہوتے ہی چیخ پڑتے ہیں قبروں کے دہن
اپنے مرقد سے نکل آتا ہے، لاشوں کا ہجوم
مادر پاک خوابوں سے تراشے ہوئے جسم
عقل مجہول، نگہ کور، زباں بے مفہوم
اپنے امروز کا کچھ علم، نہ فردا کی خبر
اپنی ہستی کی حقیقت ہی نہیں ہے معلوم

''آئینہ در آئینہ'' میں ڈیڈی نے امی کے پاکستان آنے کا حال لکھا ہے وہ پانی کے جہاز سے آئی تھیں، کیماڑی سے اسلام آباد کی جھونپڑیوں تک (اس وقت کشمیر روڈ تک جھونپڑیوں کی آبادی کا نام ''اسلام آباد'' تھا) ظاہر ہے کہ امی کے سبھی خواب چکنا چور ہو چکے تھے مگر ڈیڈی کہتے ہیں کہ ان کے ہونٹوں پر کبھی حرف شکایت نہ آیا۔

ڈیڈی اپنے کرب کا اظہار اشعار میں کرتے رہتے تھے مگر امی! ..... امی کیا کرتیں؟

کبھی کوئی افسانہ ضرور لکھ دیتیں اور دل ہلکا کر لیتیں ۔ ایک سال بعد میرا چھوٹا بھائی روشن خیال بھی دنیا میں آ گیا اور پھر دو سال بعد فروزاں بھی ..... اس وقت تک ہم ڈرگ روڈ کالونی (شاہ فیصل کالونی) میں منتقل ہو چکے تھے ۔ وہاں ۸۰ گز کے پلاٹ پر ایک چھوٹا سا کمرہ بنا کر رہنے لگے تھے جس پر ٹین کی چھت تھی ۔

ان دنوں ڈیڈی شاید بہت پریشان تھے، وہ کبھی کبھی امی سے الجھ بھی پڑتے تھے ۔ امی کہتی تھیں کہ اکثر وہ اپنے بال نوچ لیتے، دیوار سے سر ٹکرا دیا کرتے اور خود کو کوسنے لگتے، میں سوچتی ہوں، امی نے اس دوران ان کی کس طرح دل جوئی کی ہوگی ۔ کس طرح ڈھارس بندھائی ہوگی، کس طرح ہمت بڑھائی ہوگی، وہ خود بھی تو انہیں حالات سے گزر رہی تھیں (کہا جاتا ہے کہ اس دور میں بھی ڈیڈی نوکری سے علیحدہ کر دیئے گئے تھے اس واقعے پر ان کی ایک نظم ''آگ میں پھول'' میں بھی ہے جس میں وہ امی سے مخاطب ہیں) امی کے کاغذات میں مجھے ایک اور نظم ملی ہے جو روبینہ (فروزاں) کی غالباً پہلی سالگرہ پر کوئی تحفہ نہ ملنے پر لکھی گئی تھی ۔ اس نظم سے ڈیڈی کی ذہنی کیفیت سمجھی جا سکتی ہے ۔ امی کہتی تھیں ۔

''شاعر صاحب، بہت جلد غصے میں آ جاتے تھے ۔ کبھی کبھی سخت الفاظ بھی کہہ دیتے میں رو پڑتی تو پھر مجھے منانے لگ جاتے اور معافی مانگ لیتے ۔ مجھ سے ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی ..... مگر کیا کرتی''

یہ نظم عجیب و غریب ہے ۔ میں سوچتی ہوں، میرے ماں باپ کیسے کیسے عالم سے گزرے ہیں اور میری امی کس طرح برداشت کرتی رہیں ۔ وہ کتنی حوصلہ مند خاتون تھیں ۔ یہ نظم ڈیڈی کا بھی المیہ ہے ۔

حرفِ ندامت

روٹھیں میری زندگی، مری جاں

میں نے بچ بچ نہ جانے کیوں یک لخت
تیری خوشیوں کا کیف لوٹ لیا
تو ہنسے جا رہی تھی اور میں نے
اس ہنسی کا گلا دبوچ دیا

جانے کیوں، میری دوست، بعض اوقات
چھایا رہتا ہے مجھ پہ پاگل پن
مستقل جبر و ضبط کے باوصف
ٹوٹ جاتا ہے دل کا ہر بندھن

سوچتا ہوں تو سیکڑوں ہی خیال
ذہن میں رقص کرنے لگتے ہیں
سیکڑوں حادثوں کے نشتر غم
دل میں اک ساتھ اترنے لگتے ہیں

ساری دنیا، تمام پست و بلند
میری نظروں میں گھوم جاتے ہیں
ساری دنیا کے دل، بہ چشم نم
اپنے دکھڑے مجھے سناتے ہیں

کوئی بڑھیا مرے قریب آ کر
سر پہ رکھتی ہے اتنے پیار سے ہاتھ
جیسے میں ہی ہوں اس کا لخت جگر
اس کو میری تلاش تھی دن رات

پھر وہ بڑھیا پلک جھپکتے ہی
دھار لیتی ہے اک دلھن کا روپ
جو کبھی چاندنی سی لگتی ہے
اور کبھی شام کی اترتی دھوپ

پھر یکایک اسی دلھن کا جمال
پالنے میں ہمکنے لگتا ہے
میری ''روبینہ'' کی طرح اک دم
زندگی سے الجھنے لگتا ہے

زندگی کیا ہے ''دودھ کی بوتل''
زندگی کیا ہے ایک نان جویں
ایک آسودہ حال ماں کی گود
ایک دلہن کی جگمگاتی جبیں

میری روبینہ . . . . . یہ مری گڑیا
جانے اس کو دکھائے کیا تقدیر
اس کے حق میں بنے گا یہ ''زیور''
کوئی پازیب یا کوئی ''زنجیر''

تم کو بھی کیا دیا مقدر نے
ایک چھوٹا سا جھونپڑا . . . . . بچے
ایک شوہر، غریب اور شاعر
تم نے دیکھے تھے خواب کیا ''سچے''

ایسی نظمیں پڑھ کر امی پر کیا گزرتی ہوگی۔ ڈیڈی کے لئے ان کے دل میں جتنی عزت اور محبت تھی اس کی گواہ ان کی خاموشی اور مسکراہٹ تھی۔ وہ اگر شاعرہ ہوتیں تو خدا جانے کیا کچھ لکھ جاتیں۔ ہمارے معاشرے میں جب شاعر اپنی ''رفیق زندگی'' کے بارے میں کھل کر نہیں لکھتا تو شاعرہ اپنے ''شوہر'' کے بارے میں کیا لکھ سکتی ہے۔ میری نظر سے سوائے رشیدہ عیاں کے مجموعہ اشعار ''شمیم کے نام'' کے کوئی ایسی کتاب نہیں گزری جو ''شوہر کی محبت'' کی گواہی دے۔ ہاں ادا جعفری اور کشور ناہید نے کچھ نظمیں ضرور لکھی ہیں۔ اس طرح چیدہ چیدہ تحریریں اور بھی ہوں گی مگر ایک شخصیت پر پوری کتاب صرف رشیدہ عیاں نے لکھی ہے۔

خیر، یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ میں فی الحال ڈیڈی کی تحریروں میں اپنی امی کو تلاش کر رہی ہوں۔ حالات سے تنگ آ کر ۵۵ء میں ڈیڈی حیدرآباد سندھ چلے گئے کہ چھوٹی جگہ شاید زندگی سنور جائے۔ حیدرآباد میں نیا نیا ریڈیو پاکستان قائم ہوا تھا۔ امی کے کاغذات میں ڈیڈی کی ایک مطبوعہ نظم ''ادھوری کہانی'' کے اوراق بھی ملے جس کے پہلے صفحے پر ڈیڈی کے ہاتھ کا تحریر کردہ مختصر سا خط

بھی ہے۔ یہ نظم ''شاعر'' (بمبئی) کے دسمبر ۵۵ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی اور ڈیڈی نے حیدرآباد سندھ سے امی کو بھیجی تھی۔ خط کے اوپر مخدوم محی الدین کا یہ مصرعہ لکھا ہے۔

''مری حیات، مری کائنات، میرا اثاثات''

''معراج! اپنی شادی کی ساتویں سالگرہ قریب ہے (۱۴/فروری ۵۶ء) سوچ رہا ہوں تمہیں کیا تحفہ دوں۔ پچھلے دنوں ایک نظم لکھی تھی جو میری پوری زندگی پر محیط ہے۔ میرے ہم نام رسالے ''شاعر'' میں چھپی ہے۔ یہ رسالہ ایک بہت بڑے شاعر حضرت سیماب اکبرآبادی نے برسوں پہلے آگرہ سے نکالا تھا۔ اب ان کے بیٹے اعجاز صدیقی بمبئی سے نکالتے ہیں۔ یہ نظم تمہیں تحفے میں بھیج رہا ہوں۔ کوشش کروں گا میں بھی ۱۴/ کی شام تک پہنچ جاؤں۔ آج کل بہت مصروف ہوں۔ جادے اور روشے کو پیار، تمہارا۔۔۔۔۔۔شاعر صاحب''

''ادھوری کہانی'' بھی ایک طویل نظم ہے میں وہ اشعار لکھتی ہوں جن میں امی کے حوالے سے ڈیڈی کے احساسات ہیں۔

کیسی کیسی نہ امنگیں تھیں، تمنائیں تھیں
تو دلہن بن کے جب آئی مرے غم خانے میں
کہکشاں وسعت گردوں سے اتر آئی تھی
میری آنکھوں کے چھلکتے ہوئے پیمانے میں
ایک جنت تھی پشیماں میرے ویرانے میں
سوچتا تھا کہ خود اس آگ میں جل جاؤں مگر
تجھ کو سر تا بہ قدم رشک گلستاں کردوں
نکہت و رنگ لٹاتے ہوئے محلوں کی طرح
تیری دنیا کو بھی فردوس بداماں کر دوں

زندگانی کی حقیقت کو فروزاں کر دوں

رات دن فکر معاش اور محض فکر معاش
بس یہی محور تاریک تھا اور میری حیات
کون سی صبح پسینے میں شرابور نہ تھی
کس شب ماہ نے پائی غم فردا سے نجات

ایک تھی میرے لیے دھوپ ہو یا چاندنی رات

تیرے ملبوس پہ پیوند ابھی ہیں کہ جو تھے
رنگ کجلائے چلا جاتا ہے چولہے کا دھواں
آنکھ کے گرد سیاہی سی بڑھے جاتی ہے
کھا گیا تیری جوانی کو ترا سوز نہاں

کتنا بے رحم ہے ..... بے درد نظام دوراں

ڈیڈی کو شدت سے یہ احساس تھا کہ انھوں نے امی کو کوئی ''سکھ'' نہیں پہنچایا۔ وہ امی کی خاموشی اور مسکراہٹ میں بھی کچھ اور ہی کیفیت محسوس کرتے تھے۔ ان کی ایک نظم ''غم حاصل'' کے دو تین شعر ملاحظ کیجیے۔

اُس کو پا کر بھی دل افسردہ رہا کرتا ہے
اُس کو پا کر بھی کسی شے کی کمی ہے شاید
چشم خنداں کی چمک دیکھ کے آتا ہے خیال
یہ تبسم نہیں، اشکوں کی نمی ہے شاید
جسم اک برق کا پیکر ہے، نظر کو تسلیم
دل کو ہر دم یہ گماں، برف جمی ہے شاید

اسی طرح ان کی ایک نظم ''وحشت بام و در'' ہے جس میں اپنی زندگی کے خلاف ایک غصہ، ایک جھنجھلاہٹ، ایک انتہا پر پہنچی ہوئی وحشت نظر آتی ہے۔

دو آنکھیں، دو ویراں آنکھیں
دور خلا میں تکتی ہوں گی
روتے ہوئے بچوں کی چیخیں
سارے گھر میں بھٹکتی ہوں گی
میری آس میں چلتی سانسیں
خشک گلے میں اٹکتی ہوں گی
دل پہ پتھر برساتا ہے
جب بھی گھر کا خیال آتا ہے
جس جانب بھی نظر کرتا ہوں
کوئی مجھ پہ ہنس پڑتا ہے
چاک جیب و تہی دامن پہ
ایک اک منظر ہنس پڑتا ہے
میری ہر اک جہد بقا پہ
قبر کا پتھر ہنس پڑتا ہے
آنکھ میں خون اتر آتا ہے
جب بھی گھر کا خیال آتا ہے

جب زندگی اس مقام پر پہنچ گئی ہو۔ ڈیڈی کے محسوسات اور جذبات کا یہ عالم ہو، تو امی پر کیا کچھ نہ گزرتی ہوگی مگر امی بھی بڑے مضبوط دل کی مالک تھیں۔ انھوں نے ہار نہیں مانی۔ وہ ضبط

کرتی رہیں اور ڈیڈی کی ہمت بڑھاتی رہیں۔ ڈیڈی فلمی گانے بھی لکھنے لگے تھے جو بہت مقبول ہو رہے تھے۔ اس سلسلے میں ڈیڈی کو لاہور بھی جانا پڑتا تھا۔ انہیں بہترین نغمہ نگاری کے کئی ایوارڈ بھی ملے۔ ڈیڈی اور خلیل چچا کا نام فلموں کی کامیابی کی ضمانت بن گیا۔ انہوں نے ریڈیو کی نوکری چھوڑ دی اور فلمسازی شروع کر دی۔

ہم لطیف آباد کے کوارٹر میں رہتے تھے جسے امی پیار سے "گہوارہ" کہتی تھیں، پھر انہوں نے گیٹ پر سنگ مرمر کی تختی پر یہ نام کندہ کروا کے لگوا بھی دیا تھا۔ ڈیڈی کے لاہور میں زیادہ رہنے کی وجہ سے ہم بچوں کی ساری ذمہ داری امی پر آ پڑی تھی۔ امی اکیلے ہماری نگہداشت کرتیں۔ ہماری تعلیم اور ہماری ضروریات زندگی ..... سبھی ان کی نظر میں تھیں۔ وہ گھر کے تمام فرائض خود انجام دیتیں۔ یہی نہیں، اسی دوران میں انہوں نے ادیب فاضل بھی کر لیا۔ انہوں نے ایک بار بڑے فخر سے اپنے ایک کارنامے کا ذکر کیا۔

"یہ میرے سسر کی آرزو تھی، وہ چاہتے تھے کہ ان کا بیٹا اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو، بڑا افسر بنے۔ خیر ان کی یہ آرزو تو ان کے پوتے روشن خیال نے پوری کر دی لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی آرزو میں نے پوری کی۔ میں نے اس مقصد کے لئے خود پڑھنا شروع کر دیا۔ "ادیب فاضل کا کورس" ایم اے اردو کا کورس بھی کم و بیش وہی تھا مگر ادیب فاضل، بی اے کے برابر سمجھا جاتا ہے۔ انگریزی کے امتحانات پاس کرنے کے بعد البتہ ایم اے کرنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ شاعر صاحب اس وقت تک سٹی کالج حیدرآباد سے بی اے کر چکے تھے اور ایم اے میں داخلہ لے چکے تھے۔ انہوں نے ۶۴ء میں سندھ یونیورسٹی سے ایم اے کیا۔ ان دنوں وہ "لوری" بنا رہے تھے۔ "لوری" بھی بہت کامیاب رہی، تمہارے دادا جان جب ہم سے ملنے انڈیا سے پاکستان آئے تو شاعر صاحب کا پی ایچ ڈی کا رجسٹریشن کارڈ دیکھ کر خوشی کے مارے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے انہوں نے مسکرا کر ہم دونوں کو گلے سے لگا لیا۔

امی نے عہد کر رکھا تھا کہ اپنے بچوں کو بھی اعلیٰ تعلیم دلائیں گی "لوری" کی ریلیز تک کراچی کے ایک کمرے والے پلاٹ پر ڈیڈی نے نیا مکان بنوالیا تھا اور ہم وہاں منتقل ہو گئے تھے ڈیڈی نے دوسری فلم "گڑیا" کی تیاری شروع کر دی۔ کراچی میں اللہ نے ہمیں ایک اور بہن سے نوازدیا۔ زرافشاں جسے ہم "گڑیا" کے نام سے پکارنے لگے۔

امی کی آرزو تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں۔ میں نے پری میڈیکل انٹرمیڈیٹ کا امتحان دیا مگر کچھ نمبروں سے میڈیکل کالج میں داخلے سے رہ گئی۔ میں رونے لگی، ڈیڈی نے تسلی دی کہ دوبارہ امتحان دے دینا۔ رونے سے کیا حاصل، گرتے ہیں شہسوار ہی میدان جنگ میں ..... مگر امی نے ڈیڈی کو سمجھایا۔

"لڑکیوں کی عمر پر بھی نظر رکھنا پڑتی ہے، ان کے پاس اتنا ٹائم نہیں ہوتا کہ بار بار امتحان دیں، یہ بات انہوں نے کب ڈیڈی سے کہی مجھے معلوم نہیں البتہ ڈیڈی مجھے سارے علوم کی فضیلتیں سمجھانے لگے۔ وہ مختلف اوقات میں یہی باتیں کرتے۔

ان دنوں مجھے رشتے بھی آنے لگے تھے لیکن غیر گھرانوں کے ..... قریبی رشتے داروں کے سبھی بچے ہم سے چھوٹے تھے۔ امی کو سب سے بڑی فکر یہی تھی۔ میرے ساتھ میری دوسری بہنیں فروزاں اور غزالاں بھی بڑی بڑی نظر آنے لگی تھیں۔

لڑکیوں کی شادی ویسے بھی اندھیرے میں تیر چلانے کے مترادف ہوتی ہے۔ ماں باپ اسی لئے بہت خوف زدہ رہتے ہیں اور پھر یہ ہمارے گھر کا پہلا تجربہ تھا اس لئے دل کا دھڑکا غیر فطری نہیں تھا۔ امی اور ڈیڈی کی ہمت نہیں ہوتی تھی کہ کسی غیر گھرانے کے رشتے کو منظور کر لیں بس یہی کہہ کر ٹال دیتے کہ ابھی بچی پڑھ رہی ہے۔ امی مجھے اعلیٰ تعلیم ضرور دلانا چاہتی تھیں مگر اچھا اور جانا پہچانا رشتہ بھی ان کی اولین ضرورت تھی۔ میری خوش قسمتی کہ انہیں دنوں ہندوستان سے ڈیڈی کی ایک خالہ زاد بہن کا لڑکا پاکستان آگیا۔ وہ بی ایس سی تھا۔ اس کی والدہ بھی اپنے بھائی

بہنوں، اپنی والدہ اور اپنی بیٹیوں سے ملنے آئی تھیں۔ ان کے چھوٹے بھائی خواجہ معین الدین یہیں رہتے تھے۔ ڈیڈی کو وہ بچپن سے جانتی تھیں انہوں نے مجھے دیکھتے ہی اپنے بیٹے کا پیام دے دیا۔ امی اور ڈیڈی کو بھی صاحبزادے پسند آ گئے مگر ڈیڈی نے رشتہ داری کا فائدہ اٹھا کر دو سال کی مہلت مانگ لی۔ امی اور ڈیڈی چاہتے تھے کہ میں کم از کم گریجویٹ ہو جاؤں، میں گریجویٹ ہوئی تو انور صاحب کے والدین ہندوستان میں تھے اور ان کی پاکستان نیشنلٹی کی کارروائی جاری تھی۔ اب کے انہوں نے مہلت مانگی اور صرف منگنی کرنا چاہی۔ ڈیڈی فوراً راضی ہو گئے، امی البتہ فکر مند تھیں۔ ڈیڈی نے ایم اے کی تجویز رکھ دی امی نے کہا "آپ کی ننھیال کا گھرانا ہے، بہت مذہبی ہے۔ لڑکی کو اسلامیات میں ایم اے کرائیے" ڈیڈی چونکے ..... "اس ڈگری کا کیا مستقبل ہے؟"

"مجھے اپنی بچی کے مستقبل کی فکر ہے۔ بچی اگر علم کے راستے سے اپنے مذہب سے واقف ہو تو کیا برا ہے۔ سسرال میں اس کی عزت بڑھے گی"

ڈیڈی نے امی کے خیال سے اتفاق کیا اور مجھے "اسلامیات" کی فضیلتیں سمجھانے لگے ڈیڈی کی لائبریری میں ہر مذہب پر کتابیں تھیں۔ اب بطور خاص اسلامی کتابوں سے مجھے سرفراز کیا گیا اور میرا داخلہ ایم اے (اسلامیات) میں ہو گیا۔ میرے ساتھ فروزاں کو بھی بی اے (آنرز) میں داخلہ دلایا گیا تاکہ دونوں بہنیں کراچی یونیورسٹی ساتھ آیا جایا کریں۔ ہم دونوں بہنیں (تمام رشتے داروں میں) پہلی لڑکیاں تھیں جو یونیورسٹی پڑھنے کے لئے جا رہی تھیں۔ یہ ایک بڑی مثال تھی جو ہماری امی اور ڈیڈی نے قائم کی تھی۔ بچوں کی تعلیم اور تربیت کے معاملے میں امی کا رویہ بہت سخت ہوتا تھا۔ وہ زبان سے زیادہ نہیں کہتی تھیں بس آنکھوں کے تیور سے ہم سمجھ جاتے کہ ان کا موڈ کیسا ہے اور انہوں نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ پھر ڈیڈی کی سفارش بھی کوئی کام نہ آتی۔ وہ بیٹیوں کے ساتھ ساتھ بیٹوں پر بھی کڑی نظر رکھتی تھی۔ روشن خیال تو اب کافی بڑا ہو گیا تھا، اوج کمال جو اس سے سات سال چھوٹا تھا اور پھر ذوالجمال اور بلند اقبال ..... سبھی کی ایک ایک حرکت، ایک

ایک دلچسپی کا امی کو علم رہتا تھا۔ کن لڑکوں میں اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ کس کے ساتھ کھیلتے ہیں، کون سے رسالے اور کتابیں پڑھتے ہیں۔ وہ ہر بات سے باخبر رہتی تھیں۔ ڈیڈی کے فلم سے متعلق ہونے کے سبب وہ یہ بھی دیکھتی تھیں کہ ہمارے گھر میں فلمی رسالے اور اخبار کون کون سے آتے ہیں سوائے ''نگار'' کے کوئی رسالہ گھر میں نہیں آسکتا تھا۔ ہماری فلمی صحافت بہت بدنام تھی نا ..... ہزار اسکینڈل ان میں چھپتے تھے۔ سچ یہ ہے کہ وہ ڈیڈی کی فلمی مصروفیات کو بھی بادل ناخواستہ برداشت کر رہی تھیں۔ ہم لڑکیاں تو سمٹی سمٹائی رہتی تھیں مگر لڑکے کبھی کبھی حد سے نکل جاتے۔ عمر کے ساتھ ان کے مشاغل اور دوستیاں بھی بدلتی تھیں۔ یہ تینوں لڑکے ماشاءاللہ قد بھی نکال چکے تھے امی کی اب بھی خواہش تھی کہ کوئی لڑکا ڈاکٹر ضرور بنے۔ ہمارے گھرانے میں کوئی ایم بی بی ایس ڈاکٹر نہیں تھا۔ وہ اولیت کا سہرہ اپنے بچوں کے سر باندھنا چاہتی تھیں۔ چنانچہ بلند اقبال کو جب میڈیکل میں داخلہ ملا تو وہ ''ہیرو'' بن گیا ویسے بھی سب سے چھوٹا ہونے کے سبب وہ امی کا لاڈلا تھا ہی ..... مگر اب تو سارے خاندان میں مثال بن گیا تھا۔ وہ امی کے لاڈ پیار کے سبب کبھی کبھی غلط فائدہ بھی اٹھا جاتا۔ امی اپنے اصولوں کی پابند تھیں۔ ایک دن انہیں ڈانٹ پلا دی بس پھر کیا تھا وہ منظر دیکھنے کے قابل تھا۔ لاڈلے بیٹے کا غصہ ..... امی نے ڈانٹ تو دیا مگر خود بھی پریشان ہو گئیں، ایسے وقت وہ ڈیڈی سے مدد لیا کرتی تھیں۔ چنانچہ دونوں میں کوئی صلاح ومشورہ ہوا اور ڈیڈی نے اپنے انداز میں اسے منانے کی کوشش کی۔ امی کے کاغذات میں بلند اقبال کے نام ڈیڈی کا منظوم خط مورخہ ۶/جولائی ۷۸ء انہیں لمحات کی یادگار ہے۔ ڈیڈی نے کتنے پیار سے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

مرے بیٹے ..... مرے پیارے بلند اقبال ..... میرے خوبرو بیٹے
سنا ہے ..... تم کو اپنی پیاری امی کی نصیحت کچھ گراں گزری؟
سنا ہے ..... وہ تمہیں یہ کہہ رہی تھیں

اپنے کالج کے سوا تم دوستوں کے ساتھ تفریحاً کہیں جاؤ
تو ابا جان یا امی کو بتلا بھی دیا کرنا
سنا ہے ..... کچھ یہی باتیں تھیں ..... جن پر تم خفا ہو کر بہت جھلائے
اور آنسو بہا کر اپنے کمرے میں چلے آئے
مرے بیٹے ... تمہیں میں کیسے سمجھاؤں
تمہارے ذہن پر تو سارے گھر کو ناز ہے اتنا
کہ ہم سب دل ہی دل میں فخر کرتے ہیں
خدا کا شکر ادا کرتے ہیں ہم دونوں .....
کہ اس نے آخری بیٹا بھی ہم کو اتنا پیارا
اس قدر اچھا دیا
اللہ سب کو ایسے بیٹوں سے نوازے
مگر چندا ..... بس اتنا سوچ لو
ماں باپ جو کچھ سوچتے ہیں
وہ محبت کا تقاضہ ہے
ابھی تم نوجواں ہو
اور ہمارے واسطے ایسے ہو جیسے شاخ پر کھلتا ہوا غنچہ
بہت نازک
خدا تم کو ہواؤں سے سدا محفوظ رکھے
ہوائیں ..... جو نظر آتی نہیں ہیں اور چلتی ہیں
ہوائیں ..... جن کی زد میں پھول بھی کھلتے ہیں ..... لیکن

ٹوٹتے رہتے بھی ہیں اکثر
خدا تم کو ہر اک ایسی ہوا سے دور رکھے
(تم کو ایسی ہر بلا سے دور رکھے)
تم سدا ہنستے رہو اور زندگی کی ساری خوشیاں تم کو مل جائیں
مگر بیٹے ..... تم اپنی ماں کے دل سے بھی، کبھی اپنے لئے سوچو
وہ ''ناداں دل''
جو بچوں کے لئے دیوانہ رہتا ہے
ذرا سی بات پر بے چین ہو جاتا ہے
رہ رہ کر دھڑک اٹھتا ہے
کیوں آخر؟

محبت ..... اور اک اندھی محبت ہے
تم اس اندھی محبت کو سمجھ کر بھی، ابھی شاید نہیں سمجھے
تم اپنی ماں کی باتوں پر خفا ہو؟
ہاں ..... تمھیں حق ہے
مگر اتنا نہیں ..... جتنا انہیں حق ہے
وہ اپنا حق سمجھ کر تم کو ..... سب کو ڈانٹتی ہیں
اور پھر مجھ سے یہ کہتی ہیں
''اُسے جا کر منا لیجے''
کہو میں ان سے جا کر کیا کہوں؟
تم مَن گیے ہو نا؟

ظاہر ہے کہ ڈیڈی کے اس خط کو پڑھ کر کون بچہ روٹھا رہ سکتا ہے۔ بلند اقبال خط ہاتھ میں لے کر آہستہ آہستہ امی کے کمرے میں گیا اور کچھ دیر خاموش کھڑے رہ کر امی کی زانوں پر سر رکھ دیا، امی نے بھی اسے فوراً اپنے گلے لگالیا۔ امی کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے اور بلند کے بھی ..... یہ منظر میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

امی کی محبت عجیب وغریب ہوتی تھی۔ اس رات ہمارے دستر خوان پر بلند کی بہت سی من پسند چیزیں تھیں گرم گرم ''پورن پوریاں'' یعنی (مرہٹوواڑہ) مہاراشٹر کے خاص میٹھے پراٹھے بھی تھے جنہیں ہم سب دودھ میں چور کر کھاتے رہے۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ ڈیڈی، امی کے آگے ہاتھ جوڑ رہے ہیں اور وعدہ کر رہے ہیں کہ بس ..... یہ آخری فلم ہے ..... میں فلم انڈسٹری چھوڑ دوں گا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ امی نے روشن خیال کو (آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر) انکل محمد علی کی طرح بال جماتے دیکھ لیا تھا۔

فلم ''گڑیا'' میں ڈیڈی کے بیشتر ریڈیو کے ساتھی کام کر رہے تھے۔ انکل محمد علی، ان کے بڑے بھائی انکل ارشاد علی، انکل ایس ایم سلیم، انکل محمود علی، آنٹی سنتوش رسل اور ڈیڈی کے ایک بہت ہی عزیز دوست انکل محمود سردار (پروفیسر محمود علی رضوی) جن کی دو بیٹیاں ..... ڈاکٹر فرحین جمال اور نجیبہ اقبال، اب میرے دونوں چھوٹے بھائیوں ذوالجمال اور بلند اقبال کی بیویاں ہیں یعنی میری چھوٹی بھابیاں)

''لوری'' لاہور میں بنی تھی اس میں بھی انکل محمد علی تھے مگر اس وقت ہم بہت چھوٹے تھے۔ ''گڑیا'' کراچی میں بن رہی تھی اور ہم کالج اور یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ ڈیڈی نے بس ایک بار ہمیں شوٹنگ دکھائی تھی۔ مگر روشن خیال دو تین بار فلم اسٹوڈیوز جا چکا تھا۔ وہ ریڈیو اور ٹی وی پر خبریں بھی پڑھتا تھا۔

ٹی وی پر وہ بہت خوبصورت لگتا۔ میری اکثر سہیلیاں اس کی تعریف کرتیں وہ یونیورسٹی میں بھی ہیرو بنا رہتا۔ وہ زمانہ فلم انڈسٹری میں ڈیڈی کے عروج کا زمانہ تھا مگر امی شاید اس ''عروج'' میں مضمر کوئی ''زوال'' کا منظر بھی دیکھ رہی تھیں۔ انہوں نے ڈیڈی سے صاف صاف کہہ دیا ''ہم، چاہے دوبارہ غربت کے دور میں چلے جائیں مگر آپ یہ کام چھوڑ دیں گے۔ پاکستان کی فلم انڈسٹری ایسی نہیں کہ آدمی ''نیک نام'' نکل سکے۔ ہم دولت کی خاطر اپنے بچوں کا مستقبل داؤں پر نہیں لگا سکتے''

ڈیڈی نے اپنی مثال دی۔ ''آپ نے کسی فلم ایکٹریس کے ساتھ کبھی میری کوئی تصویر دیکھی؟ جب کہ میں پروڈیوسر اور ڈائریکٹر بھی ہوں۔ ''لوری'' بھی آپ دیکھ چکی ہیں اور ''گڑیا'' بھی دیکھیں گی۔ آدمی ہر جگہ اپنے خیالات اور اپنا معیار بھی ساتھ رکھتا ہے'' ڈیڈی بھی غصے میں آ گئے تھے۔

''آپ کو تو میں بچپن سے جانتی ہوں۔ آپ اپنے خیالات کے پابند رہے ہیں اور پھر آپ شاعر و ادیب ہیں۔ ایک مخصوص شہرت رکھتے ہیں۔ میرے بچے نئی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے خیالات مختلف ہو سکتے ہیں''

''ٹھیک ہے، انہیں اپنے دور میں رہنے دو''

''مگر ہمارا معاشرہ بہت پیچھے ہے۔ ہمارے گھرانوں کی قدریں پرانی ہیں۔ ہم دو زمانوں کے درمیان زندگی گزار رہے ہیں۔ ہمیں سوچ سمجھ کے فیصلہ کرنا پڑے گا۔ ابھی میری بیٹیوں کی شادیاں بھی ہونی ہیں۔''

بیٹیوں کی بات آتے ہی ڈیڈی لاجواب ہو جاتے اور سوچنے لگتے۔

میرے ڈیڈی اور امی دونوں بہت روشن ذہن کے مالک تھے مگر ان کی نظر اپنے ماضی، اپنے حال اور اپنے مستقبل پر بھی رہتی۔ امی انہیں سمجھاتیں تو وہ ٹھنڈے دل سے ان کی باتوں پر سوچتے یوں بھی امی جب کوئی فیصلہ کرتیں تو وہ اٹل ہوتا اور ڈیڈی کو مان لینا پڑتا۔ چنانچہ ڈیڈی نے

فلم ''گڑیا'' اپنے پارٹنر کے حوالے کر دی اور خود اس سے دست بردار ہو گئے۔ انہوں نے فلمی نغمے بھی لکھنا چھوڑ دیئے۔ اسلامیات میں ایم اے کرنے کے بعد انور صاحب سے میری شادی ہو گئی، وہ ریڈیو انجینئر تھے ان کا تبادلہ حیدرآباد ہو گیا۔ سندھ یونیورسٹی میں اس وقت ڈیڈی کے دوست شیخ ایاز وائس چانسلر تھے، میں نے ڈاکٹریٹ کرنا چاہا۔ ڈیڈی ایاز صاحب سے ملے اور مجھے ریسرچ فیلو شپ مل گئی۔ ایاز صاحب نے ڈیڈی کو بھی یونیورسٹی میں پڑھانے پر آمادہ کر لیا اور وہ پروفیسر ہو گئے

امی کی آرزو پوری نہ کرنے کی خلش میرے دل میں ہمیشہ بیدار رہی حالانکہ ہمارے گھر میں اب دو بچے ڈاکٹر بن چکے تھے۔ ڈاکٹر بلند اقبال اور میری سب سے چھوٹی بہن گڑیا (ڈاکٹر زر افشاں سید) جو بلند سے سات سال چھوٹی تھی۔ ادھر میری بیٹیاں بھی بڑی ہو رہی تھیں۔ میں نے بھی طے کر رکھا تھا کہ اپنی بڑی بیٹی عینی شگفتہ کو ڈاکٹر بناؤں گی چنانچہ وہ امی کی زندگی میں ڈاکٹر بن گئی اور یوں میں نے ان کی آرزو پوری کر دی۔ میں نے ہی نہیں، میری چھوٹی بہن فروزاں نے بھی اپنے بڑے بیٹے فراز کو ڈاکٹر بنا دیا اور یہی نہیں انڈیا میں میرے چچا عنایت علی جنہیں امی بیٹے کی طرح چاہتی تھیں (جو ڈیڈی سے پندرہ سال چھوٹے ہیں) انہوں نے بھی اپنی ''بھاوج پاشا'' (''پاشا'' ڈیڈی کی عرفیت ہے) کی آرزو یوں پوری کی کہ اپنے بڑے بیٹے نشید کو ڈاکٹر بنا دیا اور ان کی بیٹی افشاں بھی انشاء اللہ اسی سال ڈاکٹر ہو جائے گی۔

اپنی منظوم سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' کے آخر میں ڈیڈی نے ایک شعر لکھا تھا۔

بس ایک کام کیا ''میں'' نے زندگی بھر میں
کہ سارے بچے ہیں تعلیم یافتہ گھر میں

ایک دن میں نے ڈیڈی سے کہا، یہ شعر آپ نے غلط لکھا ہے، آپ کو یوں لکھنا چاہئے تھا۔

بس ایک کام کیا ''ہم'' نے زندگی بھر میں
کہ سارے بچے ہیں تعلیم یافتہ گھر میں

ڈیڈی ہنس پڑے، امی کی طرف دیکھا اور اپنی غلطی کا اعتراف کرلیا۔ ''دوسرے ایڈیشن میں یہ غلطی درست کردوں گا''

ڈیڈی، امی کو بہت چاہتے تھے وہ بھی ان کی بہت عزت کرتی تھیں۔ اتنے بے تکلف ہونے کے باوجود وہ انہیں ''شاعر صاحب'' کہتی تھیں۔ حالانکہ محبت کے رشتے تکلفات سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ فلم انڈسٹری چھوڑنے کے بعد ڈیڈی نے لطیف آباد کا اپنا کوارٹر ''گہوارہ'' اور کراچی کا ۸۰ گز کا مکان بیچ دیا اور الفلاح سوسائٹی (شاہ فیصل کالونی) کے کمرشل ایریا میں دو سو گز کا ایک مکان بنوایا اور اس کا نام ''گہوارہ'' رکھ دیا۔

میری امی کا پسندیدہ نام ..... ''گہوارہ'' جس میں ان کے آٹھ بچوں نے پرورش پائی۔ پھر امی اور ڈیڈی نے اپنے چار بیٹوں کے خیال سے اسے چار منزلہ بنا دیا۔ دو بیٹے تو روزگار کی تلاش میں کینیڈا چلے گئے چنانچہ اوپر کی دو منزلوں میں امی نے ڈیڈی کی لائبریری بنا دی۔

آج ڈیڈی اپنے کمرے میں اکیلے بیٹھے رہتے ہیں تو مجھے بہت دکھ ہوتا ہے، ان کے اطراف ہم سب ہیں مگر وہ پھر بھی ''اکیلے'' ہیں۔ ایک دن میں کالج سے آتے ہوئے ''گہوارہ'' گئی تو ڈیڈی اپنے مخصوص ترنم میں ایک شعر گنگنا رہے تھے۔

ہم اکیلے نہیں ہیں دنیا میں
ایک تنہائی ساتھ رہتی ہے

میں نے کہا ڈیڈی کیا تازہ شعر کہا ہے؟

ڈیڈی نے کہا ..... ''نہیں، میرے دوست طاہر رضوی کا ہے، وہ بھی میری طرح اکیلا ہے'' پھر وہ کمرے کی دیواروں پہ امی کی تصاویر دیکھتے ہوئے کہنے لگے۔

گرچہ آئینہ در آئینہ ہے ہر سو رخ دوست
ایسا تنہائی کا عالم ہے کہ جی جاتا ہے

محمد انور الدین صدیقی

جانے والے کبھی نہیں آتے

کون جانتا تھا کہ اس بار جب میں پاکستان آؤں گا تو میں اپنی اس قدر چاہنے والی ہستی اپنی بھابھی کی محبت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو جاؤں گا۔ ویسے تو مجھے ان کی بیماری کی اطلاع سعودی عرب میں صبح وشام مل رہی تھی اور ان کی روز بروز بگڑتی ہوئی ناگفتہ بہ حالت کا پتہ چل رہا تھا اور میں اللہ کے گھر جا کر ان کی صحت وتندرستی اور درازی عمر کی دعائیں کرتا رہا لیکن مشیت ایزدی کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ہماری دعاؤں نے کچھ اثر نہ دکھایا اور ہماری انمول ہستی ہم سب کو زندگی بھر کا غم دے کر ہم سے جدا ہو گئیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ باری تعالیٰ مرحومہ کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور ان کے درجات بلند فرمائے۔ آمین

ویسے رشتہ میں تو وہ میری ممانی لگتی تھیں لیکن میں انہیں شروع ہی سے بھابھی کہتا تھا اور ان سے مذاق بھی کر لیتا تھا۔ اکثر حمایت بھائی ہماری امی جان مرحومہ سے پوچھتے کہ مجھے بھائی کس رشتے سے کہتا ہے اور مرا سادہ سا جواب ہوتا۔ بھابھی کے رشتے سے آپ کو بھائی کہتا ہوں۔ میں ان کی کون کون سی باتیں یاد کروں، کن کن پہلوؤں پر روشنی ڈالوں ان کی ہمہ گیر شخصیت کا احاطہ کرنا بے حد مشکل ہے۔ ان کے اُٹھنے بیٹھنے کا اپنا ایک انداز تھا۔ بات چیت کا ایک الگ انداز ہوتا تھا، جب وہ کسی سے ملتیں تو اسے یہ احساس رہتا کہ وہ ان کی سب سے بڑی ہمدرد ہیں اور سب سے بڑھ کر ان کی تربیت، جو انہوں نے اپنی اولاد کو دی اور خاص طور پر اپنی بیٹیوں کو۔

میں تو یہی کہوں گا کہ ہر ماں کو اپنی بیٹیوں کی ، ایسی ہی مثالی تربیت کرنی چاہیے۔

میں بچپن ہی سے ان کے قریب رہا ہوں جب بھی میں ان کے گھر جاتا گھنٹوں بیٹھا باتیں کرتا رہتا اور وقت کا احساس ہی نہیں رہتا۔ ان کا انداز گفتگو اس قدر شیریں ہوتا کہ چاہتے ہوئے بھی اٹھنے کو جی نہ کرتا۔ یہ بتاتا چلوں کہ ہمارے گھر برابر ہونے کے باوجود میں ان سے ملنے بہت کم جاتا تھا، وہ بھی یاد آوری پر لیکن جب جاتا تو اگلی پچھلی کسر پوری ہو جاتی۔ اب تو بس یادوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔

یہ ہماری شادی سے پہلے کی بات ہے، جب صرف منگنی ہوئی تھی میں اور میرے دوست مسعود رضوی ایک تقریب میں ساتھ تھے۔ وہاں میری ملاقات بھابھی سے ہوئی۔ میرے سلام کرنے پر انہوں نے مجھے کس طرح جواب دیا، یہ تو میں نہیں جان سکا لیکن مسعود نے مجھ سے بعد میں سوال کیا۔ یہ کون محترمہ تھیں جو تم سے اس قدر چاہت سے پیش آئیں۔ میں نے جواب دیا کہ وہ میری ہونے والی خوش دامن صاحبہ تھیں۔ تب مسعود نے فوراً پوچھا "کیا ان کی اور بھی کوئی لڑکی ہے"۔ جواب ظاہر ہے ہاں میں تھا اور اب مسعود ہمارے ہم زلف ہیں۔ اسی طرح کا ایک اور لمحہ جو میری زندگی کا ایک یادگار لمحہ ہے۔ یہ 1968ء کی بات ہے۔ یہ گھرانا کراچی سے حیدرآباد منتقل ہو رہا تھا وقتِ روانگی بھابھی نے مجھے اس قدر پیار سے اپنے گلے لگایا اور رندھی ہوئی آواز میں خدا حافظ کہا تو میں نے اس ایک لمحے میں نہ جانے اپنے لئے کیا کیا محسوس کر لیا۔ محبت، شفقت، پیار ممتا اور نہ جانے کیا کیا؟

میں اس ایک انجانے احساس کو لفظوں میں بیان نہیں کر سکتا۔ صرف اور صرف محسوس کر سکتا ہوں، جو آج بھی تازہ ہے۔ پھر یوں ہوا کہ ہم ان کی جدائی کو ایک ہفتہ بھی برداشت نہ کر سکے اور دوسرے ہی ہفتے حیدرآباد پہنچ گئے۔ بھابھی ہمیں اچانک دیکھ کر بہت خوش ہوئیں اور ساتھ ہی کچھ فکر مند بھی، بہرحال وہ بیٹی کی ماں بھی تھیں۔ تشویش تو ہونی لازمی تھی۔ پھر اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ یہ

گھرانا دوبارہ کراچی منتقل ہو گیا اور ہماری نانی اماں مرحومہ نے ہمارا رشتہ بھابھی کی بڑی بیٹی جاوداں کے لئے پیش کر دیا۔ جس کا جواب ہاں یا نہیں کے لئے ہمیں سات سال انتظار کرنا پڑا جس کے لئے میں بھابھی کو اکثر یہ کہہ کر چھیڑتا کہ آپ نے مجھ پر بہت ظلم کیا، صرف ہاں کہنے میں سات سال گذار دیئے۔ اس پر وہ مسکراتیں اور اپنے مربیانہ انداز میں جواب دیتیں کہ میاں اگر اس وقت ہاں کر دیا ہوتا تو تم لوگ اتنا لکھ پڑھ بھی نہیں سکتے تھے۔ یاد کرو اس وقت تم لوگ کن کن کلاسوں میں تھے ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے اور وہ اپنے وقت پر ہی اچھی لگتی ہے۔ وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ ادھوری تعلیم اچھی نہیں ہوتی۔ تعلیم ہمیشہ مکمل ہونی چاہئے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے بچوں نے اپنی تعلیم ہر طرح سے مکمل کی۔ اس لحاظ سے وہ ایک خوش قسمت خاتون تھیں۔ جنہوں نے اپنے سارے بچوں کو نہ صرف اعلیٰ تعلیم دلوائی بلکہ ان کے جیون ساتھی بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہی پسند کیے

ایک دفعہ جب ہم ہاں یا نہیں کی زد میں تھے۔ گھر کے کچھ بزرگ اکٹھا ہوئے۔ وہاں ہماری قمر خالہ نے ہماری تعریف میں کچھ یوں کہا کہ ''ہمارا بیٹا تو ہیرا ہے، جس پر بھابھی صاحبہ نے کہا کہ بھائی یہ تو اپنی سمجھ ہے ورنہ ہیرا بھی ایک پتھر ہوتا ہے۔ اس بات پر ہم نے اپنے دیور ہونے کا فائدہ اٹھایا اور فوراً کہا۔ ''بھابھی سچ کہا۔ ہیرے کی پہچان تو کوئی بادشاہ یا جوہری ہی کر سکتا ہے ورنہ واقعی وہ تو ایک پتھر ہے'' اور وہ صرف میری طرف دیکھ کر مسکرا دیں۔ ان کی مسکراہٹ بھی ایک مفہوم لئے ہوتی۔ وہ خاموشی میں بھی بہت کچھ کہہ جاتیں، میں سمجھتا ہوں کہ بڑا داماد ہونے کے ناطے مجھے ان کی بے حد توجہ ملی کیونکہ پہلی اولاد کو ماں باپ کا جو پہلا پہلا پیار نصیب ہوتا ہے وہ دوسروں کے حصے میں کم ہی ملتا ہے، میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے ان کا بڑا داماد ہونے کا شرف حاصل ہوا اور یہ ان کا بڑا پن تھا کہ انہوں نے مجھ جیسے ناچیز کو قبول فرمایا اور میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے میری ایک دعا قبول کی جو میں نے حرم شریف میں اپنی بھابھی اور حمایت بھائی کے لئے کی تھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے گھر کا دیدار کرائے اور عمرہ نصیب کرے کیونکہ بھابھی

کی بڑی خواہش تھی کہ وہ عمرہ ادا کریں اور اللہ کے گھر کی ہر چیز کو بہت اطمینان سے دیکھ سکیں۔ مجھے خوشی ہے کہ اللہ تعالی نے ان کی یہ دلی خواہش پوری کی اور انہوں نے عمرہ ادا کیا۔

اب اور ان کی کن کن باتوں کو یاد کریں۔ اب تو سب ایک خواب بن گئے ہیں، جب بھی میں ان کے گھر جاتا ہوں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ بھابھی بس ابھی اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے اپنے کمرے سے نکل آئیں گی اور ہماری آنکھیں ان کی منتظر رہتی ہیں لیکن ہم سب یہ جانتے ہیں کہ

جانے والے کبھی نہیں آتے...............

کمانڈر روشن خیال

میں کیا لکھوں؟

کوئی مجھ سے پوچھے کہ ماں کا غم کیا ہوتا ہے تو میں کہوں گا ..... مجھ کو دیکھو۔ میں نہ بولنے کے قابل ہوں نہ لکھنے کے ..... سر سے ماں کا سایہ کیا ہٹا گویا آسماں ہٹ گیا۔ ایک خلا میں پتھر کا بت ہو کر رہ گیا ہوں۔ جی رہا ہوں لیکن نہ جینے کی طرح ..... بس ایک احساس میرے وجود کا سہارا ہے کہ میں اپنی ماں کا سب سے بڑا بیٹا ہوں۔ مجھ پر بڑی ذمہ داریاں ہیں۔ سب کی ڈھارس بندھائے رکھنا ہے۔ سب کا غم ہلکا کرنا ہے۔ میری بڑی بہن بھی یہی کر رہی ہے ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں اور اپنی اپنی تنہائیوں میں رو لیتے ہیں۔ ہم اندر سے ٹوٹ کر رہ گئے ہیں مگر سب کی نظر میں ثابت و سالم ہیں بہت مضبوط دکھائی دیتے ہیں۔

ڈیڈی کب سے کہہ رہے ہیں کہ میں اپنی اماں پر کچھ لکھوں۔ میں جب بھی قلم اٹھاتا ہوں آنکھوں سے آنسو نکل پڑتے ہیں۔ ہاتھ لرز جاتے ہیں۔ قلم رک جاتا ہے تصور میں ایک ان دیکھا منظر جاگ جاتا ہے۔ کینیڈا میں امی کے جنازے کا منظر .....

کس کو خبر اس ایک جنازے کے ساتھ ساتھ
قبروں تک اپنی، کتنے جنازے گئے ہیں آج

کاش میں امی کے جنازے کو کندھا ہی دے پاتا۔

ڈیڈی نے فون پر مجھ سے پوچھا تھا ..... ''آپ کی امی کو کہاں رکھا جائے؟ یہاں کے بچے یہاں رکھنے پر اصرار کر رہے ہیں''

وہ سب مجھ سے چھوٹے ہیں ۔ وہ بہت دور چلے گئے ہیں ، ماں کو اپنے قریب رکھنا چاہتے ہیں ..... میں نے باجی سے پوچھا، مونا اور اوجے سے رائے لی۔ سب سے چھوٹے بھائی بلند اقبال اور سب سے چھوٹی بہن گڑیا (زرافشاں) کی ملتجیانہ آواز کینیڈا اور امریکہ سے سنی تو ہم نے اپنے سینوں پر پتھر رکھ لئے، فیصلہ کرلیا کہ امی اپنے چھوٹے بچوں کے ساتھ رہیں گی۔

باجی نے میری طرف دیکھا اور میں نے آسمان کی طرف ..... ہماری امی آسمان پر چلی گئی ہیں، زمین پر اب صرف ڈیڈی ہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں اکیلے ڈیڈی..... میں ان کے بارے میں سوچتا ہوں ۔ وہ کتنے خالی خالی نظر آتے ہیں۔ ان کے کمرے میں امی کی تصویریں لگی ہوئی ہیں، وہ انہیں دیکھتے ہیں اور چپ رہتے ہیں۔

گھر کی فضا کو مسلسل اداس دیکھ کر میں نے البم میں سے امی کی ایک ایسی تصویر نکال کر انلارج کروائی جس میں وہ مسکرا رہی ہیں۔ جب سے یہ تصویر دیوار پر لگی ہے۔ گھر میں تھوڑی سی رونق آ گئی ہے ڈیڈی نے بھی اس تصویر سے اثر قبول کیا اور ایک نظم لکھ دی ہے۔

امی کو بچھڑے ایک سال ہو رہا ہے۔ ۲۱/نومبر کو ان کی برسی ہے۔ ڈیڈی کینیڈا جانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ سب بچوں کی خواہش ہے کہ وہ کتاب ساتھ لیتے جائیں۔ سب نے اپنے تاثرات لکھ دیے ہیں۔ میں ہی رہ گیا ہوں۔

سوچ رہا ہوں۔ میں کیا لکھوں؟

میری آنکھوں میں تو آنسو کے سوا کچھ بھی نہیں

ثمینہ روشن خیال
ٹورانٹو (کینیڈا)

امی سے ایک خواہش

میرے لئے یہ بات قابل فخر ہے کہ میں محترم حمایت علی شاعر کے گھرانے کی بہو ہوں لیکن اس سے بڑھ کر یہ کہ میری حیثیت اس گھرانے میں بہو کی نہیں بلکہ بیٹی کی ہے۔ آپ نے کبھی کسی ایسے خاندان کو دیکھا جس میں بہو اور بیٹی کا، داماد اور بیٹے کا کوئی تصور نہ ہو۔ سب بیٹے اور سب بیٹیاں۔ جی میں اسی گھرانے سے وابستہ ہوں۔ میں ان بدقسمت لوگوں میں سے ہوں جن کی ذمہ داریوں سے فارغ ہوتے ہی ماں باپ، ابدی نیند سو جاتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے انہیں بس دنیا میں اپنی یہ ذمہ داری پوری کرنی تھی لیکن ساتھ ہی ان خوش نصیبوں میں شامل ہوں جنہیں سسرال میکے کی صورت میں ملتا ہے۔ میں بڑے ناز و نعم میں پلی ہوں میرے والد (سید شاہ عزیز الدین) میری (واحد اولاد ہونے کی بناء) ہر خواہش پوری کرتے تھے۔ میری امی میری کسی بات سے انکار نہیں کرتی تھیں۔ کسی بھی شخص کے لئے یہ ایک آئیڈیل انداز زندگی ہے لیکن میرے اندر ہمیشہ سے بہن بھائیوں کی ایک خواہش رہتی تھی خداوند کریم نے میری اس خواہش کو میری سسرال میں پورا کر دیا۔ اب میں تین بھائیوں اور چار بہنوں کی بہن گردانی جاتی ہوں۔ مجھے یہ کہنے میں عار نہیں کہ مجھے میرے گھر سے جو بھی تربیت ملی وہ اپنی جگہ مگر میری اصل تربیت میری ساس جنہیں بچے امی اور بڑی امی کہتے ہیں سے ملی۔ میں نے انہیں دیکھ کر اتنا کچھ سیکھا کہ بیان سے باہر ہے۔ ڈیڈی اور امی نے مجھے وہ پیار دیا کہ میں اپنے والدین (مرحومین) کو بھول گئی اور حقیقی معنوں میں انہیں ماں باپ سمجھنے لگی یہی حال میری نندوں اور دیوروں کا میرے ساتھ ہے سب میرا بہت خیال رکھتے ہیں

میری شادی کو بیس سال ہونے آئے ہیں۔ میں سوچتی ہوں یہ سال کتنی جلدی گزر گئے۔ یہ حقیقت ہے خوشیاں بھرے لمحے جلدی گزرتے ہیں۔ جب میری شادی کی بات ہو رہی تھی تو میں ڈری ہوئی تھی اس کی ایک دلچسپ وجہ ہے اور وہ یہ ہے کہ امی (میری ساس) کی ناک گرمیوں میں باورچی خانے میں کام کے دوران سرخ ہو جاتی تھی۔ لوگ کہتے تھے بھئی ثمینہ تمہاری ساس بہت غصے والی ہیں لیکن جب میں اس گھر میں آئی تو میں نے اتنی شفیق، محبت کرنے والی، متوازن شخصیت کو اپنے اطراف میں دیکھا جو میرا آئیڈیل بنتی چلی گئیں۔ مجھے ان کے ساتھ ان کے کاموں میں ہاتھ بٹانے میں لطف آنے لگا۔ میں نے ان کی شخصیت کا بغور مشاہدہ کیا اور زندگی میں توازن برتنے، لوگوں کے ساتھ مشفقانہ رویہ، دوراندیشی، طبیعت کی ملائمت، دل میں اتر جانے والا انداز، گھریلو مسائل کو سمجھنے والی نگاہ، بچوں کی تربیت کا انداز، شوہر پرستی یہ سب ان میں اتنا تھا کہ بس دل چاہتا تھا، یہ سب چیزیں اپنے اندر سمولوں۔ آج وہ ہم سے دور چلی گئیں ہیں، پھولوں کے دیس میں جہاں ان کی ملاقات اپنے ماں، باپ، بہن، ساس، سسر اور دوسرے پیاروں کے ساتھ میرے والدین سے بھی ہوئی ہوگی۔ مجھے یقین ہے وہاں بھی سب امی کے ویسے ہی گرویدہ ہوں گے جیسے یہاں تھے، میں اپنے شوہر روشن خیال سے ہمیشہ کہتی ہوں کہ میں نے دنیا میں اتنی محبت کرنے والے، ایک دوسرے کا خیال رکھنے والے میاں بیوی نہیں دیکھے، جیسے امی اور ڈیڈی ہیں۔ میرے تو ذہن اور دل و دماغ میں ماں باپ کا تصور ہی امی اور ڈیڈی سے آتا ہے۔ بچے اپنے ماں باپ سے کوئی نہ کوئی فرمائش کرتے ہیں آج میں امی سے ایک چیز مانگ رہی ہوں۔ امی اپنا زندگی گزارنے کا انداز، توازن، محبت، شفقت، دوراندیشی، رکھ رکھاؤ، شوہر پرستی، امور خانہ داری کا ہنر، میری بیٹی کو دے دیں۔ میرا آپ سے وعدہ۔ میں اس کی تربیت میں کسی چیز کی کمی نہیں ہونے دوں گی، میں اپنی بیٹی میں آپ کو دوبارہ دیکھنا چاہتی ہوں۔ وعدہ کریں۔ دیں گئیں نا؟

پروفیسر فروزاں علی
ٹورانٹو (کینیڈا)

میری امی

عمر بھر تیری محبت، میری خدمت گر رہی
میں تری خدمت کے قابل جب ہوئی تو چل بسی

مجھے کراچی سے اطلاع ملی کہ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں نے گھبرا کر ڈل کو فون کیا (ذوالجمال میرا چھوٹا بھائی، جو کینیڈا میں ہی رہائش پذیر ہے) اس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں بتایا امی ٹھیک نہیں ہیں۔ میں نے گھبرا کر پوچھا" کیا ہوا"۔ اس نے گھبرا کر جلدی سے فون یہ کہہ کر بند کر دیا" مجھے ابھی تفصیل معلوم نہیں ہوئی"۔ وہ میری گھبراہٹ پر مزید پریشان ہو گیا کہ میں اس سے مزید معلومات حاصل کروں گی۔ میں نے پھر گڑیا کو فون کیا، اس نے بتایا اس نے ابھی ابھی کراچی بات کی ہے۔ امی کی آواز میں پہلے جیسی بات نہیں ہے (گڑیا ڈاکٹر زرافشاں جو امریکہ میں مقیم ہے اور میری سب سے چھوٹی بہن ہے) میں نے بلند کو فون کیا وہ بھی پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر ہے اور میرا سب سے چھوٹا بھائی ہے) اس کی آواز تو یوں لگی جیسے دور کسی کنویں سے آ رہی ہے۔ میرے پیٹ میں عجیب تکلیف سی اٹھنے لگی۔ میں نے کراچی اپنے دوسرے، بہن بھائیوں اور اپنے بیٹے فراز کو فون کہ کیا کچھ تو معلوم ہو کہ کیا بیماری ہے؟ یہ اچانک کیا ہو گیا؟ بیماری کی تشخیص کیوں نہیں ہو رہی ہے؟ فراز نے بتایا" مختلف test لیے جا رہے ہیں" دو تین دن اور اسی سراسیمگی میں گزر گئے، میرے پیٹ کی تکلیف بڑھتی چلی گئی، اچانک اطلاع ملی، بلند ایمرجنسی میں کراچی جا رہا ہے، کہنے لگا" میں خود صورتحال دیکھتا ہوں" وہ رونے لگا، میرا دل بیٹھ گیا۔ ایسا لگ

رہا تھا کہ ہم سب ایک دوسرے سے کچھ چھپا رہے ہیں، کچھ ہے جس کو بولنے سے ہماری زبان قاصر ہے، الفاظ کہیں کھو گئے ہیں۔ حالانکہ کراچی امریکہ اور کینیڈا سب ایک ہو گئے تھے۔ ہر لمحے ایک دوسرے سے contact ہو رہا تھا مگر معلوم نہیں کیوں مجھے آج بھی محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے چاروں طرف سناٹا تھا۔ کانوں میں سیٹیاں بج رہی تھیں۔ دل تو جیسے جسم میں کہیں تھا ہی نہیں، صرف ایک خوف تھا ایک قطرہ خون تھا جو لرز رہا تھا، کپکپاہٹ تھی جس نے سارے بدن کو دبوچ رکھا تھا۔

میں نے اسی کپکپاہٹ میں کراچی فون کیا تو معلوم ہوا کہ بلند نے کراچی پہنچتے ہی امی کو آغا خان میڈیکل اسپتال میں داخل کر دیا ہے۔ میں نے اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا مانگنا شروع کر دی مگر سمندر کی ابھرتی اور ڈوبتی تیز و تند، موجوں کی طرح ہم بھی اُمید اور نا اُمیدی کے درمیان ڈوبتے رہے اور ابھرتے رہے بالآخر اطلاع ملی کہ علاج امریکہ میں ہوگا۔ میں خوش ہو گئی کچھ امید بندھ گئی اور میں امی کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔ ان کے پاس امریکہ کا ویزا نہیں تھا اس لیے وہ کینیڈا آ رہی تھیں۔ وہ میرے پاس آ رہی تھیں۔ میں نے ان کے لیے کمرہ set کرنا شروع کر دیا مگر معلوم نہیں کیوں میرے پیٹ میں تکلیف بڑھتی جا رہی تھی (اپنے فیملی ڈاکٹر سے اپنا چیک اپ کرایا تو معلوم ہوا کہ severe tension ہو گیا ہے کراچی میں بھی میری اس اچانک تکلیف کی وجہ سے کوئی مجھے امی کی طبیعت کے بارے میں نہیں بتا رہا تھا) امی کو ایئر پورٹ پر پہلی بار wheel-chair پر دیکھا تو دل ڈوب گیا مگر ان کی آنکھوں میں وہی چمک اور چہرے پر رونق تھی مجھ سے کہنے لگیں ''اتنی بھی پریشانی کیا، دنیا میں لوگ بیمار نہیں ہوتے، کیا تمہاری ماں بیمار نہیں ہو سکتی۔ ٹھیک ہو جاؤں گی حوصلہ رکھو۔ تم سب تو ایسے پریشان ہو گئے ہو جیسے مجھے معلوم نہیں کیا ہو گیا''؟ لیکن واقعی انہیں Liver Cancer، advanced stage پر diagnose ہو چکا تھا۔ حضرت اسرافیل ہمارے گھر پر صور پھونک چکے تھے، زمین پیروں کے نیچے سے کھسکنا

شروع ہوگئی تھی، پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اُڑتے دکھائی دے رہے تھے، ہمیں کوئی ہوش نہیں تھا، قدم کہیں رکھ رہے تھے، پڑ کہیں رہے تھے، بات کچھ کرتے تھے، دل سے ایک ہی آواز آتی تھی ''یا اللہ ہماری ماں کو بچا دینا۔ ہم سے مت چھیننا۔ ہم یہ غم نہیں برداشت کر سکتے''۔ امی کو دوسرے ہی دن کینیڈا سے امریکہ by-car لے جایا گیا جہاں ثریا کے شوہر وسیم (جو خود بھی پیشہ کے اعتبار سے ڈاکٹر ہیں) نے اپنے تعلقات کی بنا پر Metro Hospital میں ان کے لئے ڈاکٹرز سے appointments لے لیے تھے۔ امی امریکہ میں دو ہفتے رہیں۔ بلند اور وسیم نے امریکہ سے لے کر پاکستان، انڈیا، آسٹریلیا اور East Asia کے تمام ممالک میں امی کے Liver Transplantation کی کوششیں تیز کر دیں لیکن Cancer امی کے Liver سے نکل کر جسم کے دوسرے حصے میں اپنے قدم جمانا شروع کر چکا تھا reports کے جواب میں ہر طرف سے نااُمیدی کے signals ملنا شروع ہو گئے، امریکہ کے ڈاکٹرز نے زندگی کے بجائے موت کی deadlines دینا شروع کر دیں دوسری طرف امی اور ڈیڈی کے چاہنے والوں کے فون کالز کا تانتا شروع ہو گیا مجھے احساس ہوا کہ ڈیڈی کے ساتھ ساتھ امی کو بھی لوگوں نے ہمیشہ اتنی ہی پذیرائی دی جتنی ڈیڈی کو ملی ہے اور وہ تھیں بھی پذیرائی کے قابل۔ ایک وفا شعار، بیوی جنہوں نے بیوی ہونے کا پورا پورا حق ادا کر دیا تھا۔ ان کی عیادت خیریت معلوم کرنے کے لیے کیا امریکہ، کینیڈا، پاکستان، ہندوستان، آسٹریلیا، انگلینڈ اور یورپ کے دیگر ممالک ساوتھ افریقہ، سعودی عرب، عرب امارات، کون سی جگہ تھی جہاں سے ان کے لیے خیریت معلوم کرنے کے لیے فون نہیں آئے، ہم ان سب کے بہت مشکور ہیں جنہوں نے ہمارے اتنے برے حالات میں ہم کو یاد رکھا، ہر طرف ان کے لیے دعائے صحت مانگی جا رہی تھی۔ میرے بڑے بہنوئی انور بھائی اور دیگر رشتہ دار، حرم شریف میں ان کے لئے صحت کی دعا مانگ رہے تھے اور عمرہ کر رہے تھے پاکستان سے میرے دو بھائی روشن خیال اور اَوج کمال اور دو بہنیں جاوداں اور غزالاں کا بار بار

فون آتے رہے اور دن میں کئی کئی دفعہ صرف اس آس پر فون آتے رہے کہ وہ کوئی اچھی بات سن لیں گے لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ وہ لوگ مجبور بے بس اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ ریز رہے کہ شاید کوئی لمحہ قبولیت کا ہو جائے۔

ادھر امریکہ میں بلند، وسیم، فراز (میرا بیٹا) گڑیا (زرافشاں) رات دن ان کے ساتھ سائے کی طرح لگے رہے لیکن جس طرح رات کو دن اور دن کو رات، چاند کو سورج اور سورج کو چاند میں نہیں بدل سکتے بالکل اسی طرح اس موذی مرض Cancer کو بھی نہیں بدلا جا سکتا تھا۔

امی دو ہفتے امریکہ کے اسپتال میں admit رہیں اور پھر وہاں کے ڈاکٹرز نے بھی اس مرض سے ہار مانتے ہوئے ایک نئی medicine کا نام بتایا جس پر حال ہی میں دنیا کے 13 افراد پر research ہوئی تھی۔ یہ دوا فارمیسی پر ملنا بہت مشکل تھی مگر اس کے باوجود بلند اقبال صرف ''ایک اُمید'' کے سہارے اس دوا کو امریکہ اور کینیڈا میں تلاش کرتے رہے اور جہاں جہاں سے دوا میسر تھی بلند اور وسیم اس کو حاصل کرتے جاتے تھے اور کسی طرح اس medicine کی daily dose امی کو دی جاتی۔ یہ کم از کم 2 ہفتے کا کورس تھا لیکن بالآخر امی کو امریکہ سے Canada لانا پڑا اور یہاں کے Toronto General Hospital میں ان کو داخل کر دیا پھر ان کی موت سے جنگ شروع ہوئی۔ حقیقت میں تو ہم سب ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہے تھے اور اُسی وقت ہار چکے تھے جب Cancer ان کے جسم میں داخل ہو چکا تھا مگر ایک اُمید جو ہمارے جسموں کو ایک بیل کی طرح لپٹتی جا رہی تھی اور ہم اس سے دامن بھی نہیں چھڑانا چاہتے تھے اسپتال میں ڈل، بلند اور فراز ساری ساری رات امی کے پاس بیٹھے رہتے اور ان کو معلوم نہیں تھا کہ رات کیسے نظر آ رہی ہے اور دن کیسے گزر رہا ہے۔ اب تک تو امی کو ایک یہ ہی باور کراتے رہے کہ وہ ٹھیک ہو رہی ہیں اور کچھ ہی دن میں گھر چلے جائیں گے کیوں کہ اب وہ اسپتال کے ماحول سے اکتانے لگی تھیں مگر بتدریج وہ غنودگی میں جانے لگیں۔ ان کی آنکھوں کی مخصوص

چہک کی جگہ کمزوری اور غنودگی نے لے لی۔ ان کے لبوں پر صرف اپنے ماں باپ کا نام آنے لگا وہ عالمِ غنودگی میں صرف اماں جان اور باوا حضرت ہی کہتی رہیں۔ میں اس قانون قدرت پر حیران تھی کہ امی نے اپنے ماں باپ کا گھر 17 سال کی عمر میں چھوڑ کر ڈیڈی کا گھر آباد کیا تھا۔ وہ ڈیڈی کی زندگی میں 54 سال رہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو آٹھ بچوں سے نوازا اور اب زندگی کے آخری لمحوں میں نہ وہ ڈیڈی کو آواز دے رہی ہیں اور نہ اپنے ان بچوں کو جن کے لئے ہر لمحے ان کی جان حاضر تھی۔ آج یہ سب ان کے اطراف موجود تھے مگر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے ان کا وہ نال کا رشتہ اپنے ماں باپ سے دوبارہ جڑ گیا تھا۔ یہ کیسا نظام قدرت ہے وہ 54 سال کا ساتھ کہاں چلا گیا۔ ہم سب بہن بھائی امی کے اطراف موجود تھے ان کی ہر سانس کے ساتھ ایسا لگتا تھا ہماری سانس بھی ان کے ساتھ بند ہو رہی ہے۔ ڈیڈی امی کے سرہانے موجود تھے ان کے چہرے پر ہزار چھپانے کے باوجود دکھ اور غم نظر آ رہا تھا وہ ضبط و برداشت کی تصویر بن گئے تھے۔ ہم بار بار رو کر ڈیڈی سے لپٹ جاتے۔ یہ کیا ہو گیا ڈیڈی! ہمارے گھر کو کس کی نظر کھا گئی لیکن وہ بہت حوصلے کے ساتھ ہماری ہمت بندھاتے ان کا دل خود کرچی کرچی ہو رہا تھا۔ وہ آنسوؤں سے بوجھل تھے۔ وہ خود کسی کے کندھے پر سر رکھ کر اور کسی سے لپٹ کر رونا چاہتے تھے لیکن اپنے بچوں کے سامنے حوصلے کی دیوار بن کر کھڑے ہو جاتے ہمیں سمجھاتے اور کہتے بیٹا ہمت سے کام لو۔ اللہ مالک ہے وہی زندگی دینے والا ہے۔ مجھے یاد آتا ہے اکثر ہم لوگ امی کو آواز دیتے۔ ''امی دیکھیے کون کون آیا ہے آنکھیں کھولیں'' وہ ڈوبتی نظروں سے تھوڑی دیر تک ہماری طرف دیکھتی رہتی تھیں، وہ صرف آواز پر آنکھ کھولتی تھیں ایسا معلوم ہوتا تھا ان کا ذہن کچھ نہیں سوچ رہا ہے میں اکثر امی کو کہتی ''امی دیکھیے کمرے میں کون موجود ہے'' کیوں کہ ڈیڈی کی آواز پر یا ان کے کھنکارنے پر امی کی آنکھوں میں جنبش پیدا ہوتی تھی جیسے ہی میں کہتی ''دیکھیے ڈیڈی آپ سے کیا کہہ رہے ہیں'' اور ڈیڈی اپنی مخصوص آواز میں امی کو آواز دیتے ''معراج'' یکایک امی کی ادھ کھلی آنکھیں آواز کا تعاقب کر کے ڈیڈی پر رک

جاتیں ان کے چہرے پر چاندنی سی بکھر جاتی ۔ مسکراہٹ واقعی ڈیڈی کی ''معراج'' تھی ۔ بہت وفادار ۔ وہ تو ان کے کھانسنے پر بھی بے چین ہو جاتی تھیں ''امی آپ کیوں اتنی دور چلیں گئیں'' آپ نے ڈیڈی کے ساتھ کیے ہوئے وفاداری سارے وعدے نبھا دیئے ۔ ان کے سارے بچوں کو بڑا پال پوس کر پڑھا لکھا کر ۔ شادی بیاہ کے فرائض تک پورے کر دیے ان کے ساتھ ڈیڈی کے قدم سے قدم ملا کر چلتی رہیں اور اب جب سارے فرائض پورے ہو گئے تو آپ چلی گئیں ۔ سارے کام ختم کر کے تا کہ آپ کی وفاداری پر کوئی الزام نہ آئے ۔ آپ ویسے بھی کام ادھورا چھوڑنا پسند نہیں کرتی تھیں تو پھر ڈیڈی کے ساتھ کیئے گئے وعدے کیسے ادھورے رہتے ، وہ تو آپ کا دین و ایمان تھے ۔ امی کا انتقال 16 ویں رمضان المبارک (۲۱/ نومبر ۲۰۰۲ء) کو عین افطار کے وقت ہوا جب کہ پاکستان میں بروز جمعہ سحری کا وقت تھا اور کینیڈا میں افطار کا ۔ جمعہ کے مبارک دن ان کی نماز جنازہ مدینہ مسجد کینیڈا میں پڑھائی گئی اور ٹورنٹو کے قبرستان Pickering میں تدفین ہوئی ۔

امی ، اسپتال سے گھر آنے کے بعد صرف دو دن بعد ہی اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں اور بہت خاموشی کے ساتھ بغیر کسی کو تکلیف بتائے ہوئے ۔ اس وقت ہم سب بہن بھائی اور ڈیڈی سب موجود تھے ۔ ہم سمجھے وہ سو رہی ہیں مگر وہ واقعی سو چکی تھیں ، ابدی نیند ۔

امی کبھی میرے تصورات کا حصہ بن جائیں گی یہ میں نے نہیں سوچا تھا ۔ واقعی تصورات انسان کی زندگی کا لازمی جز ہیں اس کے بغیر زندگی کا تصور ہی ناممکن ہے ۔ ہم تصورات کے بغیر ایک خالی ڈبہ کی مانند ہیں جو صرف حرکت کر سکتا ہے ۔ تصورات ہی زندگی کی حرارت ہیں خواہ ان کا تعلق ماضی سے ہو یا مستقبل سے ۔ ان کے ملاپ سے ہی ہمارے وجود میں ہلچل ہے ۔ آج میری ماں میرے تصور کا وہ حصہ ہے جس کے بنا میں نامکمل ہوں بلکہ ہم سب نامکمل ہیں ۔ اپنے چاہنے والوں کے تصور کے بغیر خواہ وہ موجود ہوں یا ناموجود ۔ ہمارے جسم میں توازن ہی ان تصورات کی وجہ سے ہے ۔ اب بھی جب میں بہت depress ہو جاتی ہوں تو وہ میری آنکھوں کے سامنے

آجاتی ہیں، مجھے حوصلہ دیتی ہیں اور ہمیشہ کی طرح میرا رخ میری فیملی کی طرف موڑ دیتی ہیں۔ وہ اکثر مجھے کہتی تھیں۔"بیٹا دکھ اور غم ہر انسان کا مقدر ہیں اپنے بچوں اور شوہر کا خیال رکھو، تم پر تمہارے گھر کی ذمہ داری ہے جو تم کو نبھانا ہے"۔

میں اکثر سوچتی ہوں ان کے پاس تو کوئی یونیورسٹی کی ڈگری نہیں تھی مگر اس کے باوجود ان کے زندگی کے بارے میں بہت وقیع اور ٹھوس نظریات تھے۔ وہ مثبت خیالات رکھنے والی خاتون تھیں۔ وہ مایوسی سے نہیں گھبراتی تھیں۔ میں اپنے ماں باپ کی تیسری اولاد ہوں اور میں نے اپنے گھر کے سارے نشیب و فراز کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں نے کبھی امی کو ڈیڈی سے شکایت یا فرمائش کرتے نہیں دیکھا۔ وہ ڈیڈی کی بہت عزت کرتی تھیں اور ان کی ہر لائی ہوئی چیز پر بہت خوشی کا اظہار کرتی تھیں خالی اوقات میں پڑھنا ان کا مشغلہ تھا۔ وہ اردو ادب کے ساتھ ساتھ روسی اور امریکی ادب کے ترجمے بھی پڑھا کرتی تھیں۔ قرۃ العین حیدر ان کی پسندیدہ ادیبہ تھیں۔ اکثر وہ ڈیڈی کی تازہ نظموں اور غزلوں پر تبصرہ کرتی تھیں۔ وہ بات کا مطلب بہت جلد سمجھ جاتی تھیں اور اپنی بات کو بہت نپے تلے انداز میں بیان کرتیں۔ ان کو الفاظ کی تکرار پسند نہیں تھیں۔ میں بچپن سے بہت شریر تھی اور جب میری شرارت بدتمیزی کی حد میں داخل ہوئی تو وہ صرف مجھے تیز تیز نظروں سے دیکھتیں جو میرے لئے اشارہ تھا کہ واقعی میں نے کوئی غلطی کر دی اور میں سہم جاتی۔ وہ جاہل عورتوں کی طرح مار پیٹ سے کام نہیں لیتی تھیں۔ گھر کے کاموں کو ہمیشہ نارمل طریقوں سے انجام دیا۔ کبھی اور گھرانوں کی طرح گھر میں مادی نمائش کو جگہ دینے کی کوشش نہیں کی ان کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی کہ ڈیڈی کو ذہنی آسودگی کے ساتھ تخلیقی ماحول کو برقرار رکھنے میں مدد دیں وہ بہت کامیاب خاتون تھیں اور انہوں نے بہت کامیاب زندگی گزاری، وہ سر اٹھا کر اپنے وجود کے یقین کے ساتھ زندہ رہیں۔ وہ ڈیڈی کے ملنے والوں کے ساتھ پورے اعتماد کے ساتھ بات کرتیں اور کبھی اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ صرف ایک گھریلو خاتون ہیں ان کے رکھ

رکھاؤ میں ایک مہذب اور کلچرڈ خاتون نمایاں تھیں ۔ان کی شخصیت سے نمایاں ہوتا تھا کہ انہوں نے ایک پورے خاندان کی ذمہ داری بھرپور طریقے سے انجام دی اور کامیاب رہیں۔

وہ ڈیڈی کے ساتھ ہم سب کی زندگی میں ایک خلا چھوڑ گئیں لیکن ایک ایسا خلا جو ادھورا نہیں بلکہ اپنے وجود کے احساس کے ساتھ ہر لمحے ہمارے تصور میں موجود ہے اس وقت بھی وہ گھر کا مرکز تھیں اور آج بھی وہ ڈیڈی اور اپنے بچوں کا مرکز تصور ہیں ۔مگر میں پھر یہ کہوں گی کہ ’’جب تکلیف حد سے بڑھ جاتی ہے تو خون بن کر بہنے لگتی ہے اور تصور یاد کی صورت میں آنکھ سے آنسو بن کر ٹپکنے لگتا ہے‘‘ ۔

اک یاد ہے جو دامن دل چھوڑتی نہیں
اک بیل ہے کہ لپٹی ہوئی ہے شجر کے ساتھ

امی ڈیڈی کے فیصلے ہی تھے۔ یہ ان کی ذہانت ہی تھی کہ انہوں نے ایسی بہوؤں کا انتخاب کیا جو لاجواب ہیں۔ میں اپنی بڑی بھاوج ثمینہ اور دوسری بھاوج تسنیم کی بہت مشکور ہوں کہ انہوں نے میری ماں کی خدمت بیٹیوں کی طرح کی ۔ خدا تعالیٰ ان کو ان کی اس خدمت کا اجر دے گا۔ ان کی دوسری دو بہوؤں فرحین اور نجیبہ تو ابھی دلہن ہی تھیں اور ان کے ہاتھوں کی مہندی بھی چھوٹنے نہ پائی تھی کہ امی چل بسیں۔امی ڈیڈی کے فیصلے لاجواب ہی رہے انہوں نے اپنے گھر میں ایک چھوٹا سا اصول بنالیا تھا۔ داماد، بیٹی سے زیادہ پیارا اور بہو، بیٹے سے زیادہ پیاری ہوتی ہے ۔حقیقت میں ہمارا گھر ’’گہوارہ‘‘ تھا اور امی، آپ یقین رکھیں آپ نے اور ڈیڈی نے جس ’’گہوارہ‘‘ کی بنیاد ڈالی وہ ہمیشہ قائم رہے گا اور آپ عرش بریں سے اپنے خاندان کو اسی طرح پھلتا پھولتا دیکھتی رہیں گی (انشاءاللہ)

سید مسعود احمد رضوی

(ٹورانٹو)

میری شفیق خوشدامن صاحبہ

''مسعود میاں، آپ اپنے فارغ اوقات میں کیا پڑھتے ہیں'' یہ تھا ہماری خوش دامن صاحبہ محترمہ معراج نسیم کا پہلا انٹرویو جو انہوں نے 5 جنوری 1977ء کو ہماری منگنی سے قبل کیا تھا۔ اس ایک جملے سے مجھے محترمہ کی سوچ، ان کے تعلیمی ذوق اور کاوش کا اندازہ ہوتا ہے کہ محترمہ اپنے بچوں اور لواحقین میں تعلیم کو کتنی اہمیت دیتی تھیں۔

گو کہ میں ایک باہر کا فرد تھا اور اس فیملی میں داخل ہوا تھا۔ محترمہ کے رکھ رکھاؤ اور برتاؤ سے مجھے کبھی بھی اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ میں اس گھر کا ایک قریبی ممبر نہیں ہوں۔ میں نے محترمہ کی قربت میں ایک طویل عرصہ گزارا ہے۔ ہمارے چار بچے ہیں، ان چاروں بچوں کی تربیت دیکھ بھال اور ان کی تعلیم میں فعال ہاتھ ان کی ''امّی'' کا ہی ہے (ہمارے بچے اپنی نانی کو ''امّی'' کہہ کر بلاتے ہیں) یہ بچے اپنی ''امّی'' سے اتنے قریب تھے کہ ہر کام کے لئے اور ہر بات پر ''امّی'' سے مشورہ لینے ان کے پاس چلے جاتے تھے۔ ''فراز'' ہمارا بڑا بیٹا، میڈیکل کے آخری سال میں تھا۔ اپنی ''امّی'' کی گود میں لیٹ کر ان سے اپنے دل کی بات کرتا تھا، ان سے مشورہ کرتا تھا اور ''امّی'' اپنے نواسے کے بالوں میں شفقت سے ہاتھ پھیر کر اس کی باتوں کو بڑے پیار سے approve کر جاتی تھیں۔ فراز اپنی ''امّی'' کا سب سے لاڈلا نواسہ تھا اور محترمہ کے آخری وقت تک ان کے ساتھ تھا۔ وہ اسے بے انتہا چاہتی تھیں۔

محترمہ اپنے برتاؤ، شفقت اور نرم مزاجی کی وجہ سے ہر عمر کے لوگوں میں یکساں مقبول

تھیں۔ کیا بڑے، کیا نوجوان اور کیا بچے، ان سے سب ہی متاثر تھے۔

محترمہ اپنے دامادوں اور بہوؤں میں بھی یکساں مقبول تھیں۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ان کا ہر داماد اور ہر بہو یہی سمجھتی ہے کہ وہی ان کے قریب ترین داماد یا بہو ہیں تو غلط نہ ہوگا۔ وہ ہر شخص سے اتنی ہی توجہ، پیار اور اپنائیت سے پیش آتی تھیں۔ یہ صفت بہت ہی کم لوگوں میں پائی جاتی ہے اس لحاظ سے وہ ایک ہر دل عزیز ماں کے ساتھ ایک شفیق ساس بھی تھیں۔

میں بحیثیت داماد کے ان سے بہت متاثر تھا۔ روشن خیال ان کے بڑے بیٹے ہیں جو فروزاں (ہماری بیگم) سے بڑے ہیں۔ محترمہ نے زندگی کے کسی لمحہ میں بھی مجھے روشن خیال سے کم تر نہیں سمجھا۔ اس گھر میں سب ہی بہن بھائی میری بہت عزت کرتے ہیں۔ مجھے اپنا بڑا بھائی سمجھتے ہیں اور میں بھی ان کے لئے ایسا ہی ہوں جیسے بڑے بھائی ہوتے ہیں۔ یہ ساری عزت اور شفقت محترمہ کی اپنے بچوں کی تربیت، نگہداشت اور بڑوں کا احترام کروانے کی وجہ سے ملی ہے۔

بچوں کے تربیت کی بات نکلی ہے تو اپنی زندگی کا ایک واقعہ سناتا چلوں۔ اپنی شادی کے فوری بعد اپنی سسرال میں رات گزارنے کا موقع ملا۔ ایک گھریلو تقریب تھی جس میں رات کافی گزر چکی تھی، ہمیں رات یہیں رک جانے کے لئے کہا گیا چونکہ گھر کے تمام ہی چھوٹے بڑے لوگ اس تقریب میں موجود تھے اور تقریب کو چھوڑنے دل بھی نہیں کر رہا تھا ہم رات کو رک گئے۔ سونے کے کپڑے تو کسی طرح سے مہیا ہو گئے تھے لیکن جب صبح ہوئی اور ہمیں یہ فکر لاحق ہوئی کہ دانت کیسے صاف کریں گے اور شیو کیسے بنائیں گے۔ سسرال میں کچھ مانگتے ہوئے بھی اپنی مشرقی انا آڑے آئی ہوئی تھی۔

بہر حال غسل خانے تو جانا ہی تھا۔ جب میں غسل خانے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ میرا ٹوتھ برش اور شیونگ غسل خانے میں موجود تھے۔ مجھے اس لمحہ بہت ہی اچھا لگا کہ کسی نے میری care کی ہے۔ میری ضرورت کی چیزیں ضرورت کے وقت یہاں موجود ہیں حالانکہ ہماری

شادی کو شائد ایک ہفتہ بھی ابھی نہیں ہوا تھا لیکن فروزاں نے یہ سوچ کے کہ اگر رات کو رکنے کا پروگرام بن جائے تو ان کی شائد ضرورت پیش آ جائے۔ ان چیزوں کو اپنے ساتھ رکھ لیا تھا۔ گو کہ یہ ایک بہت ہی چھوٹا سا واقعہ تھا لیکن اس کے پیچھے ایک ہمہ گیر شخصیت اپنے بچوں کی تربیت کی عکاسی کرتی ہے۔ لڑکیوں کی یہ تربیت کہ اپنے اپنے گھروں میں شوہروں کے ساتھ کس طرح سے دل جیت کے رہا جائے۔ یہ ایک بنیادی تربیت تھی اس کو ان کی چاروں بیٹیوں نے احسن طریقہ سے اپنایا اور اپنے اپنے گھروں میں اپنے شوہروں اور بچوں کے ساتھ بھرپور زندگی گزاری۔

ان کی بڑی بیٹی جاوداں (جو کہ اب نانی بن چکی ہیں) کے شوہر یعنی بڑے داماد ..... انورالدین صاحب میرے کالج کے زمانے کے ساتھی اور دوست ہیں۔ جاوداں باجی (سب کی باجی ہیں) خود ایک بہت ہی خوش اخلاق ملنسار خاتون ہیں اپنے حلقہ میں بہت ہی ہر دلعزیز اور جانی پہچانی جاتی ہیں وہ مقامی کالج میں پڑھاتی ہیں۔ دوسری بیٹی فروزاں (گھر میں روبی نام سے جانی جاتی ہے) بڑی ملنسار باتونی اور اپنے حلقہ میں بہت جانی پہچانی جانے والی خاتون ہیں۔ ہنسا ہنسانا بات سے بات پیدا کرنا ان کا کام ہے۔ ان کے شوہر کی طرف سے ان کو "Proud Mother of Four Childern" کا خطاب ملا ہے جس پر وہ بہت خوش ہیں۔ اس خطاب کو صحیح ثابت کرنے کی تگ ودو میں لگی رہتی ہیں۔ اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ ٹورنٹو میں رہتی ہیں

تیسری بیٹی مونا (غزالاں) جو میری چھوٹی بہن اور ساتھ ہی ایک اچھی دوست بھی ہے بہت ہی caring لڑکی ہے۔ مونا کی شادی سے پہلے کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے میں ایک دن جولائی کی چلچلاتی دھوپ میں باہر سے آیا تھا اور باہر سے آ کے ابھی بیٹھا ہی تھا کہ ایک ٹھنڈا یخ پانی کا گلاس مونا نے لا کے مجھے آفر کیا۔ اس وقت اس گرمی میں یہ پانی کا گلاس ایک نعمت سے کم نہیں تھا۔ اس وقت اس کی شدید ضرورت تھی۔ اس پیش کش سے مونا کے ایک بہت ہی caring person ہونے کی نشان دہی ہوتی ہے۔ مونا بھی ایک مقامی کالج میں پڑھاتی ہیں۔

چوتھی بیٹی گڑیا (جو زندگی بھر ''گڑیا'' ہی رہے گی) اپنی شادی سے پہلے مسعود بھائی کی ایک لڑاکا بہن تھی لیکن اب اتنی caring لڑکی ہے کہ یقین نہیں آتا کہ یہ وہی مسعود بھائی کی لڑاکا (ناک بہتی ہوئی) ہروقت آستین چڑھائے رہنے والی منھی سی گڑیا ہوگی گڑیا کا نام زرافشاں ہے وہ اپنی دو بیٹیوں اور شوہر کے ساتھ کلیولینڈ (امریکہ) میں قیام پذیر تھے دونوں میاں بیوی ڈاکٹر ہیں

غرض ان چاروں بہنوں کا ذکر چھیڑنے سے مراد یہ ہے کہ ان چاروں بہنوں کی گھریلو تربیت ان کی والدہ محترمہ کی مرہون منت ہے اور چاروں نے اس تربیت کے زیر سایہ اپنے اپنے گھروں کو جنت کا روپ دے رکھا ہے۔ چاروں بہنوں میں ایک مشترکہ چیز یہ ہے کہ کس طرح سے اپنے شوہروں کو اور اپنے گھر کو ایک سکون کا گہوارہ بنایا جائے اور اس میں چاروں ہی کامیاب ہیں۔ ہماری خوش دامن صاحبہ محترمہ معراج نسیم ایک خوش گفتار، سلیقہ مند اور ایک ملنسار خاتون تھیں ان کی آواز میں ایک عجیب طرح کی کشش تھی ان کا ایک جملہ جو مجھے بہت اچھا لگتا تھا اور میں اکثر ان کے ہی لہجہ میں ان کی نقل اتارنے کی کوشش کرتا تھا۔ مجھے بہت یاد آتا ہے۔ وہ جب کسی سے مخاطب ہوتی تھیں تو کہتی تھیں۔ ''میں کہہ رہی تھی'' اس طرح سے وہ اپنی بات کا آغاز کرتی تھیں۔ ان کا یہ جملہ مجھے ہروقت اور ہر لمحہ یاد آتا رہتا ہے اور میں ان کی آواز کے سحر میں ڈوب جاتا ہوں کہ اب یہ آواز کہاں سننے کو ملے گی!!!

ہماری خوش دامن صاحبہ اور سسر صاحب محترم حمایت علی شاعر کی زندگی ..... ایک مجسم محبت، پیار اور خلوص کا ایک نا ختم ہونے والا اٹوٹ رشتہ تھی۔ دونوں محترم شخصیتوں کے مابین ایک چیز مشترک تھی کہ لوگوں سے پیار کرو۔ ان کی اچھائیوں کو منظر عام پر لاؤ اور کمزوریوں اور کوتاہیوں کو پس پشت ڈال کے ان میں بھی اچھائیاں تلاش کرنے کی کوشش کرو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان دونوں عظیم شخصیتوں نے اپنے گرد، اپنے ملنے جلنے والوں رشتہ دار احباب اور دوستوں کا ایک جم غفیر جمع کر رکھا ہے۔ ان دونوں کی رفاقت کا یہ عرصہ لگ بھگ پچپن سال کا احاطہ کئے ہوئے

تھے ان پچپن سالوں میں میں نے ان کے ساتھ پچیس سال کا مختصر عرصہ گزارا ہے۔ اس دوران میں نے کبھی بھی ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں دیکھا۔ محترمہ معراج نسیم صاحبہ تمام تر خوبیوں کے ساتھ ساتھ ایک بلا کا sense of humour بھی رکھتی تھیں۔ اپنی شادی کے فوری بعد جب مجھے ان کے گھر قیام کا موقع ملا۔ صبح کے وقت دس گیارہ بجے ناشتہ سے فارغ ہو گئے ہم تمام لوگ ان کے نچلے گھر کے پچھلے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ باتوں کا سلسلہ جاری تھا۔ ڈیڈی کی پرلطیف باتیں سب کو محظوظ کر رہی تھیں۔ اچانک ڈیڈی نے اپنی بیگم سے پوچھا کہ معراج میرا وہ رومال کئی دن سے نہیں مل رہا ہے۔ تم نے کہیں دیکھا ہے کیا؟ محترمہ نے برجستہ جواب میں کہا ''شاعر صاحب آپ بہت کھوتے ہیں'' یہ جواب سن کے وہاں جتنے چھوٹے بڑے لوگ بیٹھے تھے ایک دم سے کھلکھلا کے ہنس پڑے۔ ڈیڈی نے میری طرف دیکھا۔ پھر ہنستی مسکراتی آنکھوں سے سب کی طرف دیکھا اور برجستہ جواب دیا۔ ''دیکھو تمہاری امی نے سب کے سامنے مجھے کھوتا بنا دیا'' (پنجابی زبان میں گدھے کو ''کھوتا'' کہتے ہیں)

یہ لطیفہ جب بھی میں کسی کو سناتا ہوں۔ لوگ بہت محظوظ ہوتے ہیں۔ غرض ان کی زندگی اپنے بچوں کے لئے ایک جیتا جاگتا نمونہ تھی جس میں محبت، پیار، خلوص ایک دوسرے کی عزت، اپنی فیملی کو سمیٹ کے رکھنا، غلطیوں کو درگزر کرنا، رشتے بنائے رکھنا، نئے رشتہ استوار کرنا جیسی خصوصیات تھیں۔ ان کے گھریلو ملازمین تک ان کو بہت یاد کر کے روتے ہیں اور اپنی محبت کا اظہار کرتے ہیں۔ گو کہ وہ اب ہم لوگوں کے بیچ نہیں رہیں لیکن ان کی یہ تمام باتیں روز اول کی طرح ہر وقت ہمارے ذہنوں میں موجود ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل کاملہ عطا فرمائے۔

آمین

غزالاں حمایت (مونا)
(کراچی)

اِک ہوک سی دل میں اُٹھتی ہے

۲۱/نومبر کی رات ہمارے لئے کسی قیامت سے کم نہ تھی، جب رات کے چار بجے میرے چھوٹے بھائی بلند اقبال کا کینیڈا سے فون آیا کہ ''مونا بہت ہمت کر کے اپنے آپ کو یہ خبر سننے کے لئے تیار کرلیں کہ امی جان کا انتقال ہوگیا ہے'' یہ الفاظ مجھ پر بجلی بن کر گرے۔ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ دل دھڑکنا بند ہو جائے گا۔ مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا کہ یکا یک بھائی جان اور باجی مجھے لینے کے لئے آگئے۔ میں اپنے قدموں پر کھڑی نہیں ہو پا رہی تھی۔ وہ مجھے سہارا دے کر امی ڈیڈی کے گھر لے گئے۔ امی گزشتہ ایک ماہ سے بیمار تھیں لیکن ان کے کسی بھی بچے کو اس بات کا اندازہ نہ تھا کہ وہ اتنی جلدی ہم سب کو چھوڑ کر چلی جائیں گی میں تو اس دن سے آج تک ایک غیر یقینی کی کیفیت سے دوچار ہوں کیونکہ میرا دل و دماغ اس بات کو قبول ہی نہیں کر رہا ہے۔ وہ تو ہم سب سے مل کر اپنے علاج کے لئے کینیڈا گئیں تھیں۔ ان کا ائیر پورٹ پر ''خدا حافظ'' کہہ کر لاونج سے ہاتھ ہلانا۔ وہ منظر میری آنکھیں ساری زندگی نہیں بھول سکتیں۔ کسے معلوم تھا کہ وہ اپنے گھر کو اپنے بچوں کو اور اس سرزمین کو ہمیشہ کے لئے خدا حافظ کہہ رہی ہیں۔ انتظار اور غیر یقینی کی کیفیت یہ دونوں حالتیں ہی بہت تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ جس میں میں گرفتار ہوں اور نجانے میرا خدا مجھے کب اس کیفیت سے باہر نکالے گا۔ یہ حقیقت ہے کہ امی اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔ اللہ انہیں جنت نصیب کرے۔ آمین

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے اپنی امی کو بہت صابر و شاکر اور محبت کرنے والی

ماں اور بیوی کے روپ میں دیکھا ہے۔ ہم نے انہیں کبھی ڈیڈی کے ساتھ اونچی آواز میں بات کرتے نہیں دیکھا وہ شوہر پرست بیوی تھیں۔ ڈیڈی کی ہر چیز کا بے انتہا خیال رکھتیں تھیں۔ اسی طرح سے انہوں نے ہم سب بہن بھائیوں کی ڈیڈی کی مرضی کے مطابق تربیت کی۔ انہوں نے کبھی بھی عام عورتوں کی طرح برے الفاظ استعمال کر کے اپنے بچوں کو نہیں ڈانٹا۔ بچوں کو مارنا وہ بالکل پسند نہیں کرتیں تھیں اور جہاں تک مجھے یاد ہے انہوں نے ہم سب بہن بھائیوں کو کبھی مارا بھی نہیں۔ وہ صرف نظروں سے ہم سب پر کنٹرول کرتیں تھیں۔ وہ غصہ سے دیکھتیں تو ہم سب بہن بھائی سہم جاتے تھے۔ وہ صرف مختصر الفاظ میں تنبیہ کرتیں تھیں۔ وہ اپنے تمام بچوں کی ضرورت اور تعلیم کا خیال رکھنا اپنی اہم ذمہ داری سمجھتی تھیں۔ انہوں نے اپنے تمام بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے میں ڈیڈی کا بھرپور ساتھ دیا۔ ہم نے انہیں ہمیشہ ڈیڈی کا ہم مزاج پایا۔ وہ ڈیڈی کی کبھی کسی بات سے اختلاف نہیں کرتیں تھیں اور اگر انہیں کسی بات سے اختلاف ہو تو وہ خاموشی اختیار کر لیتی تھیں مگر بحث نہیں کرتیں تھیں۔ ڈیڈی کی لائبریری کی تقریباً تمام ہی کتابیں انہوں نے پڑھ ڈالی تھیں۔ ہم نے عموماً انہیں ڈیڈی سے ادب کے موضوعات پر بات کرتے دیکھا، سیاست ہو یا شعر و شاعری وہ جو کچھ بھی پڑھتیں تھیں تو ڈیڈی سے اس موضوع پر گفتگو ضرور کرتیں تھیں اور اپنے خیالات کا بھرپور اظہار کرتیں تھیں۔ ہماری ذہنی تربیت میں ڈیڈی کے ساتھ امی کا بہت ہاتھ ہے۔ انہوں نے زندگی کے ہر موڑ پر ڈیڈی کے ساتھ مکمل تعاون کیا، چاہے مالی حالات کیسے بھی ہوں۔ جب ہم تینوں بہنیں اوپر تلے ایک ساتھ بڑی ہو گئیں تو ہمارے رشتے طے کرنا اور شادی سے متعلق دیگر معاملات کو بھی ہماری امی نے بہ حسن و خوبی سرانجام دیا۔ وہ بہت باہمت اور باحوصلہ خاتون تھیں۔ ہم چاروں بہنیں کتنی اچھی بیویاں بن جائیں، کتنی ہی اچھی مائیں بن جائیں، کتنی اچھی بہویں بن جائیں مگر ہم اپنی "امی" جیسی ماں، بہو اور بیوی نہیں بن سکتے۔ کاش کہہ کر، ہم اپنی امی کی تصویر کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک بنا لیتے ہیں وہ بہت جلد ہم سب کو چھوڑ کر چلی گئیں ہیں۔ ہم سے ڈیڈی کی

تنہائی دیکھی نہیں جاتی ۔ وہ گھر جو امی کے دم سے آباد تھا، آج بھی آباد ہے لیکن اس کے درودیوار سُونے ہو گئے ہیں ۔ اس گھر کی رونق ختم ہو گئی ہے میں امی سے ملنے روز کالج سے واپسی میں امی کے گھر جاتی تھی تاکہ تھوڑی دیر ان کے پاس بیٹھ سکوں ۔ اب بھی جاتی ہوں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی کمرے سے نکل کر آ جائیں گی مگر ان کی تصویریں دیکھ کر دل پر بوجھ لیے واپس آ جاتی ہوں خدا ہم سب بہن بھائیوں اور ڈیڈی کو صبر عطا کرے ۔

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے   اک درد جگر میں ہوتا ہے
ہم رات کو اٹھ کر روتے ہیں   جب سارا عالم سوتا ہے

امی کی مونا

شفیق الزماں
(کراچی)

چچی جان

ٹیلی فون کی گھنٹیاں دن رات بجتی رہتی ہیں ۔ روزمرہ کی زندگی کا یہ ایک حصہ ہے مگر ۲۱/نومبر ۲۰۰۲ء کی رات چار بجے جو گھنٹی بجی تو یوں لگا جیسے ٹیلی فون چیخ رہا ہو۔ ہڑبڑا کر اٹھا دوسری طرف کینیڈا سے بلند اقبال فون پر تھے۔ ''ہیلو'' میں نے کہا: ''شفیق بھائی! میں، میں بلو بول رہا ہوں شفیق بھائی'' ''امی!'' یہ کہہ کر وہ زاروقطار رونے لگا۔ میں سمجھ گیا کیونکہ چچی جان کئی دنوں سے بیمار تھیں اوران کی حالت بگڑتی ہی جارہی تھی۔

میں بلو کو دلاسہ اور تسلی تو دے رہا تھا مگر اس وقت میرے لئے مشکل مرحلہ یہ تھا کہ پچھلے پہر کی گہری نیند سے اٹھا کر مونا کو کیسے فون دوں۔ کال بھی کینیڈا سے تھی وقت کا بھی مسئلہ تھا خبر بھی اندوہناک، اتنا مشکل مرحلہ میرے لئے اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ خیر جیسے تیسے میں اس مرحلے سے گزرا۔ مونا فون پر آئیں اور دونوں بہن بھائی فون پر زور زور سے رونے لگے۔ ابھی فون رکھا ہی تھا کہ روشن، جاوداں کو لے کر آگئے تینوں بہن بھائی لپٹ کر رو رہے تھے۔ روشن رو بھی رہے تھے اور اپنی بہنوں کو سمجھا بھی رہے تھے۔ ظاہر ہے وہ ہی تو اس وقت ان لوگوں کے لئے سب کچھ تھے، چچا جان بھی کینیڈا میں تھے۔ روشن نے بڑی ہمت اور حوصلہ سے کام لیا اور بڑے صبر، ضبط و تحمل کے ساتھ اپنی دونوں بہنوں کو لے کر الفلاح چلے گئے۔

اب اندھیرے کمرے میں، میں اکیلا تھا اور چچی جان کا تصور، وہ چچی جن کے سامنے میں گھٹنوں چلتا تھا، میری عمر کا سفر ان کے سامنے طے ہوتا رہا۔ وہ ہمیشہ انتہائی محبت شفقت اور پیار

سے کہتی تھیں ''بیٹے کیا حال ہے؟'' جیسے مجھ سے میری ممی میرا حال پوچھ رہی ہوں۔ صرف ان کی زبان نہیں بولتی تھی بلکہ ان کی آنکھیں، ان کا چہرہ سب اتنے ہی پیار اور محبت سے بولتا ہوا محسوس ہوتا تھا اور شاید انہوں نے اپنے اسی پیار و محبت کی وجہ سے، مجھے بحیثیت داماد قبول کیا مگر کبھی داماد نہیں سمجھا میں یہ روایتی جملہ نہیں لکھ رہا ہوں بلکہ یہ حقیقت ہے کہ چچی جان نے مجھے ہمیشہ روشن خیال، اوجِ کمال، ذوالجمال اور بلند اقبال ہی کی طرح سمجھا اور کیوں نہ سمجھتیں میں بھی تو ان کے بیٹوں کی طرح ان کے سامنے چھوٹے سے بڑا ہوا ہوں (میرے والد حفیظ الدین اور چچا جان بچپن کے دوست ہیں) چچی جان میں وہ تمام صفتیں تو تھیں ہی جو ہر ماں، ہر چچی اور اکثر ساسوں میں ہوتی ہیں مگر میں ان کی جس خوبی اور صلاحیت کا سب سے زیادہ معترف رہا ہوں وہ ان کی چہرہ شناسی تھی چہرہ دیکھ وہ بھانپ جاتی تھیں کہ سامنے والے شخص کی ذہنی کیفیت و دلی جذبات کیا ہیں۔ خوش ہے، پریشان ہے، فکر مند ہے۔ یہ محسوس کر کے اندازہ لگا کر بڑی شفقت محبت اور پیار کے ساتھ اس سے یوں باتیں کرتی تھیں جیسے وہ اس کی کیفیت میں شیئر کر رہی ہوں، اس کی ذہنی ٹوٹ پھوٹ کو بنا سنوار رہی ہوں بظاہر، غیر شعوری طور پر ان کی یہ گفتگو کتنی شعوری ہوتی تھی، اس کا اندازہ صرف اسی کو ہی ہوتا تھا جس سے وہ بات کرتی تھیں پھر اگر داماد ہو تو اپنی بیٹی سے الگ پوچھتی تھیں کہ کیا بات ہے، شفیق (یا کوئی بھی داماد) مجھے پریشان لگ رہا تھا۔ فکر مند محسوس ہو رہا تھا ''خیال رکھا کرو'' اور اگر وہ اسے خوش محسوس کرتیں تو صرف یہ کہتیں تھیں ''شفیق بڑا خوش لگ رہا تھا'' بس خوشی کی تفصیل میں نہیں جاتی تھیں۔ ہر ایک کو اپنی آنکھوں میں تول کر رکھتی تھیں۔ کوئی ذرا سا بھی دبلا یا کمزور محسوس ہو فوراً پوچھتی تھیں ''کیا بات ہے، دبلے ہو گئے ہو کمزور لگ رہے ہو''

ذہنی کیفیت کو شیئر کرنے کا جو ذکر میں نے اوپر کیا ہے، وہ ہر عمر کے شخص کے ساتھ اس کی عمر اور رشتے کے اعتبار سے کرتی تھیں اور ماشاء اللہ ان کے ارد گرد اور اپنے ہی گھر میں، ہر عمر کے افراد ہر وقت ہوتے تھے۔ گھٹنوں چلنے والے بچوں سے لے کر بال بچوں والے بیٹے بیٹیاں،

بہوئیں داماد، پوتے، پوتیاں، نواسے اور نواسیاں سب کے ساتھ شیئر کرتی تھیں۔ چچی جان کا ہر ایک کے دل میں رہنا ہی تو ہمیں ان کی جدائی کے غم کو کم نہیں ہونے دے رہا ہے تقریباً سال گزر جانے کے بعد بھی یہ کل ہی کی بات لگتی ہے چچی جان اپنے تخت سمٹ کر رہنے اور سب کو سمیٹ کے چلنے کا ایسا ہنر جانتی تھیں کہ کبھی کسی کو محسوس ہی نہیں ہوا کہ انہوں نے آٹھ بچوں کی تعلیم و تربیت، شادی بیاہ کے مراحل کیسے طے کیے، رشتوں کو کیسے استوار رکھا اور کیسے نبھایا۔ چار بیٹیوں اور چار بیٹوں کی سسرالوں کو اپنے دل میں سمائے رکھنا صرف چچی جان کے دل ہی کی وسعت کی بات تھی۔

چچی جان کا سایہ ہم سب کے سروں سے تو اٹھ گیا مگر ان کی شخصیت، ان کی پوری زندگی کی تگ و دو نے ہمیں یہ راہ دکھائی کہ سایہ دار کیسے بنتے ہیں۔ ہم اب عمر کے اس حصے میں پہنچ گئے ہیں جہاں ہمیں بھی سایہ دار ہونے اور رہنے کا منصب مل گیا ہے ہمیں اسے نبھانا ہے۔ خدا ہمیں توفیق دے کہ ہم چچی جان جیسا ٹھنڈا، پرسکون اور مطمئن سایہ اپنے بچوں کو دے سکیں۔ اسی سے ان کی روح کو سکون ملے گا۔ دنیا کی زندگی تو روح کا ورثہ ہوتی ہے اور چچی جان یہ ورثہ ہم سب کے سپرد کر گئیں ہیں جس کا ہمیں خیال رکھنا ہے۔

اُوجِ کمال
(کراچی)

امی جی

ایک طوفان کی مانند میرے بھائی کینیڈا سے کراچی آئے اور دس دن کے ہنگامہ خیز علاج کے بعد اسی رفتار سے امی کو اپنے ہمراہ لے کر واپس کینیڈا چلے گئے۔

میں اسی دن سے عالم سکتہ میں ہوں۔ امریکہ روانگی کے وقت وہیل چیئر پر امی کا مجھ سے ملنا اور چہرے پر تبسم بکھرائے دور تک خدا حافظ کہتے ہوئے ہاتھ ہلانا، میرے ذہن کو بے قرار کئے ہوئے ہے۔ کسی پل چین نہیں آتا کہ وہ وقت روانگی ..... ایک منحوس گھڑی تھی۔

میں کس قدر بدنصیب ہوں کہ اپنی ماں کے آخری دیدار سے بھی محروم رہا ہوں۔ میری ماں جن کو تین بیٹیوں کے بعد ایک بیٹے کی تمنا تھی، وہ بیٹا کوسوں دور ماں کی جدائی کی خبر سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے نہ تو اور کیا کرے۔ اس خبر کو سننے کے لئے کم از کم میرا ذہن کسی طرح بھی آمادہ نہیں تھا، کچھ دن تو بس یہی معمول تھا کہ خالی خولی نظروں سے سب کو تکتے جانا اور جب کوئی جواب نہ بن پڑے تو بلبلا کر رو دینا۔ میرے بچے معصوم نگاہوں سے مجھے روتا دیکھتے تو میں انہیں لپٹا لیتا۔ ان کی سمجھ میں کیا آتا، میری ہی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ جسم و جاں میں ایک شدید غصے کی کیفیت تھی، نہ جانے یہ کم بخت کینیڈا ہمارے خون میں کیوں حلول کر گیا ہے۔ مرنا کسے نہیں ہے۔ اپنی ماں کا دیدار تو کر لیتا۔ مجھے قرار تو آ جاتا۔

امی جی! آپ کے جانے کے بعد تو میں ٹوٹ کر رہ گیا ہوں۔ خاموش ہو گیا ہوں۔ کم کم

بات کرتا ہوں، کوئی تیز بات کرتا ہے تو اٹھ کر وہاں سے چلا جاتا ہوں۔ کوئی دیر تک بولتا تو پھر بھی اٹھ کر چلا جاتا ہوں۔ اب دل اکتا سا گیا ہے۔ چاہتا ہوں کہ چند ضروری کام کر لوں۔ آپ جب سے گئیں ہیں میرا بلڈ پریشر بڑھ گیا ہے، نارمل ہونے کا نام ہی نہیں لیتا، تنگ آ کر دوائیں بھی لینا چھوڑ دی ہیں۔ آج بھی جب یہ تحریر لکھ رہا ہوں، میرا بلڈ پریشر 115-150 ہے۔ اپنے آپ پر بہت غصہ آتا ہے۔ چاہتا ہوں کہ بس یہ کتاب چھپ جائے۔

اے رات مجھے ماں کی طرح گود میں لے لے
دن بھر کی مشقت سے بدن ٹوٹ رہا ہے

تسنیم کمال
(کراچی)

سایۂ شفقت

میرے دادا جان، دادی جان اور بڑی پھوپھی میرے بچپن ہی میں رحلت فرما چکے تھے چھوٹی پھوپھی انڈیا میں حیات ہیں اور ایک پھوپھی پاکستان آگئیں تھیں جنہیں ہم بہن بھائی پھوپھو جان کہہ کر بلاتے ہیں ابا بھی ان کے پیچھے پاکستان چلے آئے اور ان کے ساتھ کافی عرصہ تک حیدرآباد ہی میں رہے پھر کراچی آگئے کراچی آنے کے بعد ابا نے امی کو بھی اپنے پاس بلوالیا، کراچی میں اپنے گھر کے علاوہ جس گھر سے ہمیں اپنائیت اور محبت ملی وہ پھوپھو جان کا گھر تھا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد میری شادی میرے پھوپھی زاد اوج کمال سے ہوگئی اور یوں میں اس گھر میں ہمیشہ کے لئے آگئی جس سے میرا بچپن سے گہرا تعلق تھا۔ اس گھر میں بیاہ کر آنے کے بعد پھوپھو جان کے ساتھ میرے جو شب و روز گزرے وہ بہت ہی یادگار بن گئے ہیں۔

ہمارے گھر میں ایک دوسرے کا لحاظ، محبت اور رکھ رکھاؤ بہت ہے۔ ساس، بہو، نند، بھاوج اور دیور بھابھی سب بہت مل جل کر رہتے ہیں اور اس رویے کے پیچھے ایک شخصیت کارفرما نظر آتی تھیں اور وہ تھیں پھوپھو جان، ان کے اندر بے پناہ منتظمانہ صلاحیتیں موجود تھیں انہوں نے ڈیڈی (میں اپنے سسر کو ڈیڈی کہتی ہوں) کے ساتھ بڑی کامیاب اور بھرپور زندگی گزاری ہے انہوں نے اپنے بچوں کی پرورش بہت ہی متوازن انداز میں کی۔ ہر بچے کو اس کی دلچسپی اور رجحان کے مطابق تعلیم کے اعلیٰ مدارج طے کروائے۔ اپنے رویئے اور محبت سے بچوں میں اعلیٰ اخلاقی اقدار اجاگر کیں۔ یہ انہی کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ ان کا ہر بچہ خواہ وہ بیٹا ہو یا بیٹی society میں

بہتر انداز میں survive کر رہا ہے۔

وہ دیکھنے میں انتہائی باوقار اور رعب والی خاتون تھیں۔ مگر ان کا لہجہ انتہائی دھیما اور شائستہ ہوتا تھا۔ انہیں ان کی administrative ability کی بدولت معلوم ہوتا تھا کہ کب کیا اور کون سا کام کرنا ہے اور کس طرح کرنا ہے ان کی یہ خوبی ان کی کامیاب بھرپور ازدواجی زندگی کی ضامن رہی وہ اپنی ذات میں ایک وفا شعار بیوی، ایک محبت کرنے والی ماں اور ساس اور ملنے ملانے والوں کے لئے ایک پرخلوص خاتون تھیں۔

عام طور پر مشرقی گھرانوں کا خاصہ ہے کہ ساس اپنے بہو، بیٹے کی زندگی میں بڑا عمل دخل رکھتی ہے وہ بہو کی معمولی سی بھول کو بھی ایک بڑی غلطی گردانتی ہے اور جھٹ بیٹے سے اس کی شکایت کر دی جاتی ہے اور یوں میاں بیوی کی پرسکون ازدواجی زندگی میں ہلچل مچ جاتی ہے مگر میرا اور ان کا تعلق ساس، بہو کے اس روایتی تعلق سے ذرا ہٹ کر تھا اس لئے نہیں کہ میں ان کی بھتیجی ہوں بلکہ اس لئے کہ ان کا مزاج ذرا مختلف تھا وہ اپنی دوسری بہوؤں کے ساتھ بھی اسی طرح محبت اور نرمی سے رہیں جس طرح میرے ساتھ تھیں انہیں اگر ہماری کوئی بات ناگوار گزرتی تو وہ عام روایتی جاہلانہ انداز میں نہ تو غصہ کرتیں اور نہ ہی چیخنے چلاتی تھیں بلکہ خاموش ہو جاتیں ان کی خاموشی سے ہمیں اندازہ ہو جاتا تھا کہ انہیں وہ بات ناگوار گزری ہے ان دس برسوں میں، میں نے دیکھا کہ اگر اوج اور میرے درمیان کسی بات پر بحث ہوتی تو وہ اوج کو ڈانٹتی تھیں اور مجھے پورا پورا support کرتی تھیں۔

ان میں willpower اور stamina بہت تھا وہ ہم لوگوں کی معمولی سی پریشانی پر پریشان ہو جاتی تھیں مگر اپنی ذات کے معاملے میں ان میں بڑی قوت برداشت تھی۔ ایک طویل عرصہ سے وہ Diabetic Patient تھیں مگر اس کے باوجود ان میں stamina بہت تھا اور غالباً یہی وہ چیز تھی جس کی وجہ سے ہم سب گھر والے ان کی اتنی بڑی بیماری سے بے خبر رہے ان

کے طرز عمل اور روز مرہ کے معاملات سے کہیں اس بات کا شائبہ تک نہیں ہوا کہ وہ اس قدر موذی مرض میں مبتلا ہیں۔ ان کی قوت برداشت آخر وقت تک ان کے ساتھ رہی یہاں تک کہ انہوں نے بڑی خوش دلی سے مسکراتے ہوئے موت کی آغوش میں اپنا سر رکھ دیا اور ہم سب کو اپنے پیچھے روتے ہوئے چھوڑ گئیں۔ گھر میں ہر چیز ویسی ہی ہے جیسی کہ ان کے زمانے میں تھی مگر اب ہمارا گھر، گھر نہیں رہا مکان بن گیا ہے۔

انتقال سے قبل اپنی مختصر علالت کے دوران وہ اور میں اکثر رات دیر تک باتیں کرتے تھے وہ سو کر اٹھنے کے بعد مجھے بتاتی تھیں کہ آج میں نے خواب میں باوا حضرت اور اماں جان کو دیکھا ہے اور پھر وہ مجھے اپنے بچپن کے قصے سنانے لگتیں۔ اپنے باوا حضرت، اماں جان اور بھائی بہنوں کے ساتھ گذارے ہوئے دنوں کو یاد کرتیں۔ ان کے انتقال کے بعد مجھے احساس ہوا کہ شاید انہیں یہ گمان ہو چلا تھا کہ وہ ان کے پاس جانے والی ہیں اپنے پیاروں کے پاس اپنے پیاروں کو چھوڑ کر۔

یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ وہ اتنی جلدی ہمیں داغ مفارقت دے گئیں ہم اور ہمارے بچے ان کے سایۂ شفقت سے محروم ہو گئے وہ میرے بچوں کی ایک شفیق دادی تھیں میری تین بیٹیاں ان کی گود میں کھیلی ہیں لیکن میرا بیٹا عارج کمال ان کی گود کی گرمی سے محروم رہا۔

ذوالجمال

(ٹورانٹو)

اے میری ماں ..... ڈھونڈوں تجھے کہاں

اتنی بڑی حقیقت کہ آج ہماری پیاری امی جان ہم سب کے ساتھ نہیں ہیں۔ دل یہ بات ماننے کو تیار ہی نہیں ہے۔ میرا قلم لکھ ہی نہیں پا رہا، میرے الفاظ کاغذ کے بجائے آنسوؤں کی شکل میں میرے چہرے پر اپنی تحریر لکھ رہے ہیں۔ میں اپنی امی کی کون کون سی باتوں کے بارے میں سوچوں، ان کی ہر بات، ہر لفظ، ہر واقعہ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے کہ یہ سب ابھی کی باتیں ہوں۔

امی کے جانے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ جیسے میں ابھی تک ایک چھوٹا سا معصوم بچہ تھا۔ میں اپنی ہر بات امی جان کو بتاتا تھا، ہر بات امی جان سے کہا کرتا تھا اور پھر ان کی گود میں سر رکھ کر سو جاتا تھا۔ مجھے اپنی امی کی آغوش میں اتنا آرام ملتا تھا کہ میں اپنی ساری پریشانیاں بھول جاتا تھا او میری پیاری امی ..... میں آپ کو کیسے بتاؤں۔ آپ کے جانے کے بعد میں ایک رات بھی سکون سے سو نہیں سکا، جب بھی آنکھیں بند کرتا ہوں آپ کا چہرہ میرے سامنے آجاتا ہے۔ آپ کی باتیں، آپ کا مسکراتا چہرہ اور جب مجھے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ آپ حقیقت میں ہمارے ساتھ نہیں ہیں تو میرے آنسو رکنے کا نام نہیں لیتے۔ امی جان میں اپنے دل کو کیسے سمجھاؤں، یہی وجہ ہے کہ میں گھنٹوں پکرنگ میں بیٹھ کر روتا ہوں اور جتنی دیر وہاں بیٹھتا ہوں مجھے اتنا ہی سکون ملتا ہے۔

زندگی اتنی مشکل اور کٹھن ہو جائے گی، اس بارے میں تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا، مجھے ابھی تک یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ لوگ اپنے والدین کے بغیر زندگی کیسے گزار دیتے ہیں؟

میں جن مشکلات سے گزر رہا ہوں اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔ میرا دل، دماغ ابھی تک اس بات کو تسلیم ہی نہیں کر پا رہا ہے کہ ہم لوگ بغیر ماں کے ہو گئے ہیں۔ میں کیسے سمجھ لوں کہ امی جان ہم سے دور چلی گئی ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے وہ ہم سے ناراض ہو کر چلی گئی ہوں اور ہم منالیں گے تو وہ پھر آ جائیں گی۔ پتہ نہیں کیا ہے۔ کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ! میں ہمیشہ اسی سچ اور جھوٹ کی کیفیت میں رہتا ہوں۔

بس جاتے ہوئے اک خوبصورت سی مسکراہٹ جو ہمیشہ ان کے چہرے پر ہوتی تھی، مرتے دم بھی موجود تھی اور وہ مسکراہٹ ایسی تھی کہ جیسے کوئی بات کہہ کر ہنس رہی ہوں۔

میں ابھی تک انہیں خیالوں میں ہوں۔ کیا ان کو ہماری بھی یاد آتی ہے؟ یا نہیں؟؟؟ میں کیا کروں، کیسے اپنے دل کو سمجھاؤں، میرا دل ماننے کے لئے تیار ہی نہیں ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب پاکستان جاؤں گا تو ان کو اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا پاؤں گا۔ اللہ کرے سب کچھ ایسا ہی ہو لیکن؟؟؟

ڈاکٹر فرحین ذوالجمال
(ٹورانٹو)

میری ساس، میری ماں

زمیں خاموش، فضائیں چپ چاپ
شہر ویران ہے ایک تیرے چلے جانے سے

آہ..... میں وہ دن کبھی نہیں بھول سکتی جب اکتوبر ۲۰۰۲ء میں پاکستان سے فون آیا کہ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ مجھے اور میرے شوہر کو اس بات پر حیرانی تھی کہ جب ہم ایک مہینے پہلے یعنی ستمبر میں کینیڈا واپس آئے تھے تو امی ماشاءاللہ سے ٹھیک تھیں اور ہم لوگ بہت خوش تھے۔ گھر میں ہر وقت ہلا گلا رہتا تھا۔ خوب رونق ہوتی تھی۔ ہر وقت ہنسی مذاق ہوتا تھا ایک مکمل اور پرسکون گھر کا ماحول تھا۔ امی ڈیڈی کے ساتھ.....

امی..... جی ہاں میری ساس، مجھے کبھی اس بات کا احساس نہیں ہوا کہ یہ میری ساس ہیں۔ مجھے ایسا لگتا تھا کہ جیسے یہ میری سگی ماں ہیں۔ میں شادی کے بعد جب اس گھر میں آئی تو مجھے بالکل اپنے گھر کا ماحول ملا۔ ویسے ہی بہن بھائی کی طرح گھر والے، پیارے پیارے، بہت زیادہ خیال کرنے والے امی، ڈیڈی (میری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ میرے شوہر شادی کے دو مہینے کے بعد ہی کینیڈا چلے گئے تھے) تو میرا زیادہ ٹائم امی، ڈیڈی کے ساتھ ہی گذرتا تھا۔ مجھے امی، ڈیڈی کے ساتھ بہت اچھا لگتا تھا۔ امی میرا بہت خیال رکھتی تھیں۔ ہر وقت مجھے اپنے ساتھ رکھتی تھیں مجھے ہر بات بتاتی تھیں۔ وہ ایک انتہائی پرخلوص، ذمہ دار، سلیقہ مند، ایک باوقار خاتون تھیں۔ وہ بہت سلجھی ہوئی گفتگو کرتی تھیں۔ وہ ایک کامیاب خاتون تھیں ..... ایک بیوی کے روپ میں، ایک

ماں کے روپ میں اور ایک ساس کے روپ میں، ہر روپ میں وہ ہم سب کے لئے ایک مثال تھیں سب کے ساتھ ان کا رویہ بہت اچھا ہوتا تھا وہ ہر ایک کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آتی تھیں۔ تو جب ان کی طبیعت کی خرابی کی خبر یہاں پہنچی تو ہم لوگ بہت پریشان ہو گئے کہ یہ سب اچانک کیا ہو گیا پھر جب ان کو علاج کی خاطر کینیڈا لے کر آئے تو ہم یہ دعا کر رہے تھے کہ اللہ تعالیٰ امی کو صحت اور لمبی زندگی عطا کرے۔ دعا اور دوا دونوں ہی کر رہے تھے لیکن اچانک وہ ہو گیا جو نہیں ہونا چاہئے تھا۔ وہ ہم سب کو روتا ہوا چھوڑ کر وہاں چلی گئیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔

اللہ تعالیٰ اپنے اچھے بندوں کو جلدی بلا لیتا ہے اور پھر صرف ان کی یادیں اور باتیں ہی رہ جاتی ہیں لیکن دل پھر بھی نہیں مانتا کہ وہ ہم میں نہیں ہیں۔ آج بھی ان کی باتیں ان کی آواز سنائی دیتی ہے۔

دنیا میں بہت کم لوگ ہوتے ہیں جن کے اندر ساری خصوصیات ہوتی ہیں۔ میری ساس، میری ماں، واقعی میں ایک عظیم خاتون تھیں۔

''اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے''

ڈاکٹر بلند اقبال
(وِنی پیگ، مینی ٹوبا۔کینیڈا)

امی جان

تھوڑا وقت لیا ہوتا
مجھ کو جینے دیا ہوتا
کہتی تھیں ''تم جیو سدا''
مجھ کو مرنے دیا ہوتا

تم تو خالق تھیں میری
میرے ساتھ جیا ہوتا
خواب انگاروں جیسے ہیں
آنکھوں میں دریا ہوتا
کیسی دھوپ ملی مجھ کو
کاش ترا سایہ ہوتا

میں تو مر کے بھی جیتا رہتا ہوں
کاش میں آپ کے قریں ہوتا
آپ کی یاد کے سوا، امی
میرے سینے میں کچھ نہیں ہوتا

جینا ہے یہی تو پھر
مرنا کسے کہتے ہیں
پھر موت ہی کو کہہ دو
جینا اسے کہتے ہیں
(۱۳/ جنوری ۲۰۰۳ء)

امی

ایک تمہارے جانے سے
پھیل گئے ویرانے سے
دیکھو کیسے بکھرے ہیں
میرے خواب سہانے سے

امی تمہارے غم میں
ہر شئے بدل گئی ہے
میری تو زندگی ہی
اشکوں میں ڈھل گئی ہے

مری روح کو جہاں میں ہے بس ایک شے کی حاجت
فقط آپ کی محبت، فقط آپ کی محبت
(۱۴/ جنوری ۲۰۰۳ء)

امی جان

پیدائش سے پہلے اور مرنے کے بعد
اجیارے سے پہلے، اندھیارے کے بعد
پلک جھپکتے دیکھا صدی کا پھیرا پورا
ماں کے بنا ہے میرا جیون خواب ادھورا
(۲۰/ جنوری ۲۰۰۳ء)

عجیب خواہش ہے آج دل میں
کہ میری امی بھی میرے گھر میں
اسی طرح ایک دن جنم لیں
میں جس طرح ان کے گھر میں اترا
ہمارے رشتے تو اور ہوں گے
مگر یہ گھر تو بسا رہے گا

دل صد چاک کو آخر مجھے سینا ہوگا
میری امی کی دعا ہے، مجھے جینا ہوگا

(۲۱/جنوری ۲۰۰۳ء)

مرنے کے بعد

میری ماں کے مرنے پر
دو جنازے اٹھے تھے
ایک تو میری ماں کا تھا
دوسرا شاید میرا تھا

امی کی تدفین ہوئی
مجھ کو سب ہی بھول گئے
اب میں اکیلا پھرتا ہوں
میری روح بھٹکتی ہے
ہر اِک جسم سے پوچھتی ہے
تم نے مری ماں دیکھی ہے؟

(۳۰/ جنوری ۲۰۰۳ء)

نثری نظمیں

آہ...... ٹوٹ گئی
زندگی کی ہر آس
روشنیاں اندھیروں میں ڈھل گئیں

دن سالوں میں بٹ گئے
کیسا، ہو کا عالم ہے
تنہا روح بھٹکتی ہے

زندگی بلک بلک کر روتی ہے
یہ سب کیسے ہو گیا؟
میں چپکے سے مر گیا!

(۲/فروری۲۰۰۳ء)

میں روتا ہوں
آنسو گرتے ہیں
اتنے سرخ جیسے لہو ہوتا ہے
دل دھڑکتا ہے
سازوں میں ایسا سوز ہے
جیسے بین کرتے ہیں
عجیب کرب ہے
لفظ ادا نہیں ہوتے
ہونٹ ساکت ہیں
ترستے ہیں
کسی کو "ماں" کہنے کو

(۳/فروری۲۰۰۳ء)

کیا میں زندہ ہوں؟

عجیب اندھیرا ہے چاروں طرف
کوئی سایہ دکھائی نہیں دیتا
کوئی اجالا بینائی نہیں دیتا
وقت جیسے سمٹ گیا ہے
لمحے لمحے میں بٹ گیا ہے
عجیب خلا ہے چاروں طرف
کوئی درد، کوئی لذت نہیں
کوئی چاہت کوئی آہٹ نہیں
زمین و آسمان، صبح و شام نہیں
اندھیرے روشنی کا کوئی نام نہیں
کیا ہو رہا ہے یہ؟
کیوں ہو رہا ہے یہ؟
کیا میں مر گیا ہوں؟
کیا میں زندہ ہوں؟

کچھ بھی نہیں

میں شاعر نہیں
دانشور نہیں
فقط اِک طبیب ہوں
اور طبیب بھی ایسا
جو اپنی ماں کو بچا نہ سکا
تو میں طبیب بھی نہیں ہوں
تو میں کیا ہوں
زمین کی دھول ہوں
ہوا کا جھونکا ہوں
فقط خیال ہوں، جس کا کوئی مطب نہیں
فقط جسم ہوں، جس کا کوئی سایہ نہیں
میں کچھ نہیں ہوں
کچھ بھی تو نہیں ہوں

(۹/فروری ۲۰۰۳ء)

امی جان

کتنا ہی میں روکوں، رکتا ہی نہیں ہے
دل رونے سے میرا، تھکتا ہی نہیں ہے
کیسے بھول جاؤں
ان آنکھوں کی چاہت کو
ان ہونٹوں کی مسکراہٹ کو
ان ہاتھوں کی گرمی کو
ان کے لمس کو نرمی کو
کیسے بھول جاؤں؟

اٹھا ہے عجب ''رونا'' مجھ میں
رکتا ہی نہیں، تھمتا ہی نہیں
اماں کے بنا کیا حال ہوا
ایسا تو کبھی سوچا ہی نہیں

مجھے یقیں ہے تم یہیں کہیں ہو میرے آس پاس
میں بیٹا ہوں تمہارا، کیسے چھوڑ دو گی میرا ساتھ

(۹/ فروری ۲۰۰۳ء)

کچھ پابند اشعار

نہیں سے جو میں آج ''ہاں'' ہو گیا
یہ جانا کہ میرا زیاں ہو گیا
میں جب تک نہیں تھا تو بالکل نہ تھا
مگر اب صدائے فغاں ہو گیا
وہ آغاز ہی میرا انجام تھا
یہ انجام کیسا، کہاں ہو گیا
نہیں میں چھپی تھی مری زندگی
یقیں سے میں آخر گماں ہو گیا

(۱۲/ فروری ۲۰۰۳ء)

نثری نظمیں

یہ جو روح کا جسم سے ناطہ ہے
وہی آواز کا لب سے ہے
نظر کا آنکھ سے ہے
حس کا دماغ سے ہے
کچھ ایسا ہی ناطہ
جیسے لمحوں کی جدائی میں
فاصلہ صدیوں کا ہے
آہ... اب ایسا ہی ناطہ
میرا اور میری اماں کا ہے

(۱۳/فروری ۲۰۰۳ء)

امی آپ کے جانے سے
گھر میں کیسی تنہائی ہے
مکیں چپ ہیں
درودیوار روتے ہیں

لفظ گم

ہونٹ ساکت
نظر..... پتھر
وقت جیسے تھم گیا ہے
ماضی، حال میں ضم ہو گیا ہے
زندگی۔ دھند ہی دھند
موت۔ اُمید کی کرن

(۱۴/فروری ۲۰۰۳ء)

ہر اک آہٹ پر
بس یہی گماں ہے
شاید آپ آئی ہیں

شاید روٹھی ہوئی تقدیر سنبھل جائے
شاید جینے کی کوئی سبیل نکل آئے
عجیب ہوں میں
کہنے کو طبیب ہوں میں

کیا اتنا بھی نہیں جانتا
موت۔ اک آزادی
اور زندگی۔ زنداں
ہر اک عالم میں
قدرت کی فکر پنہاں
پھر زندگی کیا۔ ہر اک شئے خوبصورت ہے
اور زندگی نہ ہوتو۔ موت خوبصورت ہے
فقط صبح وشام کا حلقہ ہے۔ زندگی کیا ہے
فقط روح کی آزادی۔ موت کیا ہے

(۱۴/فروری ۲۰۰۳ء)

ڈاکٹر بلند اقبال
(ونی پیگ، مینی ٹوبا۔ کینیڈا)

یا بی بی سیّدہ

مجھے معلوم ہے کہ زندگی کا عرصہ متعین ہے۔ تمام جانداروں کی طرح انسانی جسم کا بھی ایک مخصوص دورانیہ ہے اور یہ بھی کہ زی حس سے حس کی کیفیت میں شامل ہونا اور دوبارہ زی حس کی طرف جانے کا عمل صدیوں سے اس سیارے پر جاری ہے۔ خود میں بھی تو اوروں کی طرح اچانک اس حادثے کا شکار ہو گیا تھا اور اب اسی مخصوص دورانیہ سے گزر رہا ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ انسانی دماغ صدیوں کے ارتقائی مراحل کے بعد بلوغت کی اعلیٰ منازل طے کر چکا ہے اور شاید سیکھنے کا یہ سلسلہ ہی انسانی عمل کو عادتوں میں اور عادتوں کو تہذیب میں تبدیل کرتا رہتا ہے۔ اکثر و بیشتر ہم نیند کی حالت میں انسانی ذہن کی کیفیات اور نیورو ٹرانسمیٹر زکی تبدیلی کے عمل کو جاگنے کے بعد بیان کرنے کے قابل ہو جاتے ہیں مگر مرنے کے بعد دماغی تبدیلیوں کو بتانے سے قاصر ہیں۔ روحانیت کی مضبوط بنیادیں اسی وجہ سے اپنی موجودگی کا سبب بن گئی ہیں۔ پیدائش کے چند سالوں کے بعد ہی امی کے ایک جملے نے مجھ پہ زندگی کے بیشتر راز منکشف کر دیے تھے۔ میں شاید چھ یا سات برس کا تھا اور میں نے امی سے تُتلاتے ہوئے کہا تھا ''میں سوچتا رہتا ہوں پر سوچ ہی نہیں آتی'' اور امی اِک دم سے کھل کھلا کر ہنس پڑی تھیں۔ کہنے لگیں ''بیٹا خوب پڑھنا اور پھر غور کرنا اُس کے بعد سوچنے پر سوچ آتی ہے'' مجھے یاد ہے میرا معصوم دماغ اُس وقت شاید اس بات کے مطلب کو سمجھ بھی نہیں پایا تھا مگر آج جب اس جملے کی بالیدگی پہ غور کرتا ہوں تو اِک اِک کر کے زندگی کے سارے پردے پورے معنوں کے ساتھ میرے سامنے گرنے لگتے ہیں۔

وقت کس قدر تیزی سے گزر جاتا ہے۔ جب میں 9یا10 برس کا تھا، شام کے آخری پہر میری آنکھ لگ گئی تھی۔ اچانک میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ایک بوڑھا سا آدمی بن گیا ہوں جو لکڑی ٹیک ٹیک کر چل رہا ہے اور سوچ رہا ہے کہ عمر کا اگلا مرحلہ کیا ہوگا ..... موت؟ اُف، میں پسینے میں شرابور اُٹھ گیا تھا۔ پھر میں نے امی سے اِس خواب کا تذکرہ کیا تھا۔ امی نے جواب دیا تھا ''بیٹا خوب پڑھنا لکھنا پھر تم دیکھو گے یہ بڑھاپا تم پر کبھی بھی نہیں آئے گا'' اُف میرے خدایا! یہ جملہ آج بھی میرے ذہن میں گونجتا رہتا ہے۔ کس قدر معنی ہیں اِس جملے میں۔ بڑھاپا اگر علامتی اظہار ہے جاہلیت کا، تو علم ایک مستقل جوانی ہے۔ میری امی کس قدر عام سی لگنے والی خاتون تھیں پر اُن کی انسانی فطرت پر کس قدر گہری نظر تھی! کبھی بھی میں نے ان کو زور سے بات کرتے ہوئے نہیں دیکھا، ایک بار بھی تو نہیں، اِس کی وجہ شاید وہ مشاہداتی قوت تھی جو ہر آدمی کا حصہ نہیں۔ ہم روتے ہیں، چیختے ہیں، چلاتے ہیں، زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے مرحلے پر بھی کسی بھی سخت حالات میں بھی ہمارے آنسو نکل آتے ہیں مگر وہ ساری زندگی ایک باوقار عورت کی طرح رہیں، اِس بات کے باوجود کہ ڈیڈی کی مستقل آمدنی کبھی بھی نہیں تھی اور اس پر گھر میں آٹھ بچے، جن میں لڑکیاں تو شروع ہی میں تھیں پھر اُن کی شادیاں، تعلیم کے اخراجات، سوشل ایڈجسٹمنٹ، تربیت کے اعلیٰ مدارج اور زندگی کے ہر مرحلے پہ ڈیڈی کی شخصیت سازی میں اُن کے ساتھ ساتھ اور اُن کے لیے ذہنی سکون کا سبب، یہ سب آسان نہیں تھا۔ ہمارے غیر متوازن معاشرے میں اِس قدر توازن کہ ہر بچے کی زندگی اس کے ذہنی اور عملی معیار کے مطابق بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اُس سے بھی کہیں زیادہ، میں اکثر اپنے اِردگرد دیکھتا ہوں، دو یا چار بچوں کے بعد ہی ماؤں کا، ذمہ داریوں کا شور، شوہر کے بے روزگار ہونے پہ گھر میں برتنوں کے ٹوٹنے کی آوازیں اور معاشی حیثیت بدلنے پہ پوری شخصیت کا اُتھلا پن، معمولی معمولی باتوں پہ طلاق تک کی نوبت اور فضول ہوائی باتیں.....

امی تو کوئی خاص ڈگری یافتہ بھی نہیں تھیں، تو کیا شخصیت کی تعمیر میں ڈگری کا کوئی حصہ نہیں ہوتا؟

میں اب بھی سوچتا ہوں کہ ان میں اس قدر ضبط کا مادہ کیوں اور کیسے تھا۔ وہ اکثر ان باتوں کو سن کر مسکرا دیتی تھیں اور زیادہ سے زیادہ یہی کہتی تھیں کہ" آج کل بچے تعلیم یافتہ تو ہیں، پر تربیت یافتہ نہیں"۔ اِس سے زیادہ میں نے اُن سے نئی نسل کے لیے کبھی کوئی شکوہ نہیں سنا۔ ہمارے گھر ساس، بہوؤں کا جھگڑا تو دور کی بات، تکرار بھی نہ تھی اور اُس کی بنیادی وجہ امی اور ڈیڈی کی بیٹوں اور بیٹیوں سے زیادہ بہوؤں اور دامادوں کا خیال اور محبت تھی۔ کتنے آسان اُصولوں سے انہوں نے اپنے گھر کو جنت بنایا ہوا تھا۔ تمام روایتی گھرانوں سے مختلف اور اعلیٰ اقدار کے ساتھ، اور مجھ کو یہ بھی تو یاد ہے کہ میرے میڈیسن میں داخلے کے وقت انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں چاہتی ہوں کہ تم فزیشن بنو تاکہ تمہیں عبادت کا مطلب سمجھ میں آجائے۔ آہ! اور یہ ہی ہوا، جب میں نے ہسپتالوں میں روتی ہوئی آنکھیں اور ضبط کرتے ہوئے سرخ چہرے دیکھے تو مجھے پتہ چلا کہ بعض اوقات چند الفاظ تمام عبادتوں سے افضل ہوتے ہیں اور مجھے وہ رات بھی یاد ہے جب میں پوسٹ گریجویشن کی نیت سے امریکا جانے کے لیے گھر سے نکل رہا تھا، کس قدر طویل رات تھی وہ۔ میں اُن کے پاس بیٹھا اُن سے کہہ رہا تھا" امی نہ جانے میرے دل پر دباؤ سا کیوں ہے، پتہ نہیں میں اپنے ارادوں میں کامیاب ہوں گا بھی یا نہیں"۔ امی نے جواب دیا تھا" بیٹا خود پہ بھروسہ رکھو اور میں بھی تو تمہیں خود کو ثابت کرتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں" وہ ہمیشہ کم بولتی تھیں مگر ہر لفظ معنی سے بھرا ہوتا۔ شاید یہ امی کا دیا ہوا ہی اعتماد تھا کہ جب میں گھر سے نکل رہا تھا اور ڈیڈی مجھے اپنے اُن دوستوں کے بارے میں بتا رہے تھے کہ جن پہ میں امریکا میں بھروسہ کرسکتا تھا، میں نے اچانک ڈیڈی سے کہا تھا" ڈیڈی مجھے جانے دیجیے، اللہ ہے نا، میرے لئے، بس یہی کافی ہے" اور پھر جب میں نے امریکن بورڈ کی ڈگری لے لی تو امی نے میرا ماتھا بھی چوما تھا اور کہا تھا" دیکھا بیٹا، مجھے یقین تھا"۔ ڈیڈی کافی سالوں سے امریکا آرہے تھے مگر امی اکثر و بیشتر لوگوں کے بلانے پر بھی امریکا جانے سے گریز کرتی تھیں۔ میں نے امی سے کہا تھا" امی آپ امریکا آیئے نا" اس جگہ کو

دیکھے پاکستان سے کس قدر مختلف ہے۔امی کہنے لگیں ''ہاں بیٹا اب میں وہاں ضرور آؤں گی، کیونکہ تم اب وہاں ہو، وہاں اب میرا اپنا گھر ہے پھر وہاں رہ کر میں تمہارے ابو کے دوستوں کی فیملیز سے بھی ملوں گی۔عزت نفس ان کے لہجے میں نمایاں رہتی تھی۔ مجھے یہ بھی تو یاد ہے کہ جب میں نیویارک میں تھا اور وہ میرے ساتھ تھیں اور میں نے ایک دن ان سے ہنستے ہوئے کہا تھا ''امی سوچ رہا ہوں یہیں شادی کرلوں، اچھا ہے نا، گرین کارڈ بھی مل جائے گا'' تو امی نے مجھے مسکرا کر کہا تھا' اچھا! یہ حالات ہیں، بیٹا جو لوگ زندگی میں کامیابی کے لیے چھوٹے راستے اختیار کرتے ہیں وہ عام طور پر زندگی میں چھوٹے فاصلے ہی طے کر پاتے ہیں، تم خود کی قابلیت پہ بھروسہ کیوں نہیں کرتے'' ..... اور ہاں ہم لوگ ایک دن جیکسن ہائیٹ (نیویارک) پر گھوم رہے تھے پاکستانی اور انڈین بازار پہنچ کر امی مجھ سے کہنے لگیں ''بیٹا! یہاں لوگ بہت خوش نظر آتے ہیں، کیا انہیں گھر کی یاد نہیں آتی'' میں نے کہا تھا ''نہیں امی یہ سارے خوش چہرے اندر سے اپنے گھروں کی یاد میں اکثر دکھی رہتے ہیں شاید اسی لیے اپنے آپ کو مصروف رکھتے ہیں'' امی کہنے لگیں ''بیٹا تم تو واپس آؤ گے نا'' میں نے امی کی طرف غور سے دیکھا تھا اور کہا تھا ''امی آپ جہاں جہاں ہوں گی، ٹھیک وہیں میں بھی ہوں گا'' وہ لوگوں کے مزاجوں کو بہت جلد سمجھ لیتی تھیں اور عموماً اپنے آپ کو اُسی لحاظ سے محتاط کر لیتی تھیں۔ انہیں یہ بات بخوبی پتہ تھی جو شاید بیشتر لوگوں کو نہیں معلوم کہ گفتگو میں کہاں پہ چپ رہنا ہے۔

میری عادت تھی کہ میں اکثر اپنی اہم چیزیں کہیں بھی رکھ کر بھول جاتا تھا اور پھر پاگلوں کی طرح سارا گھر سر پر اُٹھا لیتا تھا۔امی جب بھی مجھے اس حال میں دیکھتیں تو کہتیں ''بیٹا دل میں کہو حضرت بی بی سیدہ، سلام کروں گا چودہ، میری کھوئی چیز کردے پیدا'' جب سے امی کھو گئی ہیں میں نے ہر لمحے حضرت بی بی سیدہ سے یہی دعا کی ہے ....

(مطبوعہ ماہنامہ ''دنیائے ادب'' کراچی، اگست ۲۰۰۳ء)

ڈاکٹر بلند اقبال
(ونی پیگ، مینی ٹوبا۔ کینیڈا)

آنسوؤں کے ساتھ

زندگی ایک سوال بنتی جا رہی ہے۔ مذہب کے تقابل سے پیدا ہونے والا انسان، نفسیاتی الجھنوں کا شکار انسان یا مادیت کا مارا ہوا اپنے آپ میں مگن انسان۔ کیا انہیں ہجوموں کا نام زندگی ہے؟ بہت ساری بے چین روحیں میرے ارد گرد پائی جاتی ہیں۔ ہر روح اپنے آپ میں الجھی، اپنے آپ کو منوانے کے لیے بے تاب یا پھر کچھ حالات کی ماری ہوئی ٹھہری ہوئی روحیں۔ کون ہے؟ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ کبھی کبھی تو سب کچھ محض بایولوجکل (Biologocal Combination) لگتا ہے۔ آہستہ آہستہ ایک زہر شاید زندگی کی تکمیل کا ہر ایک روح میں اُتر رہا ہے۔ تمام تلخ و شیریں احساسات کے ساتھ۔ کس قدر بے معنی ہیں یہ الفاظ۔ خود کی تکمیل؟ تکمیل کے کیا معنی ہیں؟ تکمیل بھی کبھی ہوتی ہے؟ اگر ہوگئی ہے تو تکمیل نہیں، نامکمل ہے۔ پھر میں بھی تو ایک ایسی بے چین روح ہوں جو دنیا کے گنجان و آباد علاقوں میں آوارہ پھر رہی ہے۔ حیران آنکھوں سے دنیا کے تجربات کو جان رہی ہے۔ کبھی شیریں کبھی تلخ، کبھی کسی نوزائیدہ بچے کی طرح اور کبھی اکھنڈ بڑے کی طرح لیکن تکمیل سے محروم شاید ہمیشہ رہے گی کیونکہ میری روح میں ایک کمی تو شدت سے ہے، خود سے خوف، کہ تکمیل کے مرحلے میں کہیں میرا اپنا آپ، خود مجھے ہی نہ نگل جائے اور ایک دن میری روح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، خود سے پوچھنے لگی۔ کون ہے جو ہر درد کی دوا ہو؟ کیا ہے جو ہر درد کے پیچھے چھپا ہوا ہے۔ ایسا کیوں ہے کہ ہر روح رو رہی ہے اور جو ہنس

رہی ہیں وہ بھی درد چھپائے ہوئے۔ انسانی احساسات میں اس قدر زخم کیوں ہیں؟ کیا کسی روح کے پاس جواب نہیں؟ کیا ''یقین'' ہے اصل سچائی؟ اگر روح کی تسکین میں خدا کا صیغہ ہوتا تو مذاہب کے یقین کرنے پر بھی تسکین میں تشنگی سی کیوں؟ کیا مذاہب یقین کے بغیر کچھ نہیں؟ تو مذہب کچھ نہیں۔ سب کچھ ''یقین'' ہے۔ کیا یقین خدا ہے؟ اگر یقین خدا ہے تو ایمان یقین پر ہونا چاہیے۔ پھر یقین؟ یہ تو اندرونی شدت سے پیدا ہوتا ہے۔ پھر شدت کیا ہے؟ شدت تو بڑا ثانوی سا لفظ ہے پر اُس کے معنی کس قدر تھکا دینے والے ہیں۔ پھر یقین اگر پیدا ہو بھی تو کس پر ہو؟ اگر سمجھ میں بلوغت نہ ہو تو یقین تو کسی پہ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ اُف یقین پر ایمان کس قدر گہرا اور کتنا سطحی ہے۔ پھر کیا ہے؟ کتنی بے چینی ہے، کیسا دل کا عالم ہے؟ ہر روح پھوٹ پھوٹ کر روتی ہے۔ سوال سچائی کا ہے اور مذہب و یقین، محض علامات ہیں، ذہنی بلوغت کے ساتھ جن کے معنی بدل جاتے ہیں۔ پھر مذہب سے انکار یا اقرار۔ دراصل اقرار ہے، کچھ نہ سمجھ میں آنے کا، کیا انسانی ذہن سے انکار ممکن نہیں؟ کس قدر معصوم فلسفہ ہے، کتنی بھولی بھالی روحیں ہیں۔ ایمان آسان نہیں، ایمان ایک لفظ نہیں، ایمان ایک کائنات ہے اندر ہی اندر پھیلی ہوئی چاروں جانب۔ مگر پھر پھوٹ پھوٹ کر آنسو کیوں؟ کہاں ہے روشنی؟ ہر طرف اندھیرا، گھور اندھیرا۔ ساری روحیں اندھیرے میں ناچ رہی ہیں۔ آنسوؤں کے ساتھ۔

(اس مضمون سے میرے چھوٹے بھائی کی ''کیفیت'' کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے سکون عطا کرے۔ جاوداں میر)

شجیعہ اقبال
(ونی پیگ، مینی ٹوبا۔ کینیڈا)

امی جان

آج بھی جب میں ان کے بارے میں سوچتی ہوں تو ان کی بھرپور شخصیت میری نظروں میں ابھر آتی ہے۔ ان کی پرسنیلٹی graceful ۔ تکلف اور بے تکلفی کے درمیان نازک سا توازن، ان کے مزاج کا ٹھہراؤ اور بے انتہا شائستگی، امی جان اور ڈیڈی کے ہمارے امی ابو سے برسوں سے تعلقات تھے وہ جب بھی کراچی سے حیدرآباد آتے تو ہمارے گھر ضرور ملنے آتے تھے۔ کہنے کو ابو اور ڈیڈی دوست تھے مگر ان کا پیار بھائیوں سے بڑھ کر تھا۔

مجھے امی جان کو جاننے کا موقع اس وقت ملا جب سے میں بلند کی زندگی میں آئی۔ ہمارا نکاح ہوا تھا وہ نکاح کے بعد کینیڈا چلے گئے تھے اور پھر ..... اس رشتہ داری کے بعد مجھے امی جان کے ساتھ وقت گزارنے کا زیادہ موقع ملا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بخوبی ایک ایسی دلہن کے احساسات سمجھ سکتی ہیں جس کی ابھی ''رخصتی'' باقی ہے اور جسے اپنے شوہر کی شخصیت جاننے کی بے چینی ہے۔ امی جان مجھ سے بلند کے بچپن کے واقعات، طالب علمی کے زمانے کے قصے اور امریکہ میں ان کی مصروفیات کا تذکرہ تفصیل سے کرتی تھیں۔ باتوں ہی باتوں میں وہ مجھے بلند کے مزاج کے بارے میں کچھ اس طرح سے آگاہ کرتی ہیں کہ میں غیر محسوس طریقے سے اپنے مستقبل سے مطمئن ہوتی چلی گئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس طرح سے میری نفسیات سے واقف ہو گئی تھیں کہ ان سے گفتگو کے دوران مجھے اپنے تمام سوالات کے جوابات بنا پوچھے ہی معلوم ہو جاتے۔ شاید وہ میری معصوم فکر سے اچھی طرح واقف تھیں۔ امی جان سے گفتگو کے بعد میں اکثر سوچتی تھی

کہ بلند یقیناً ایک اعلیٰ کردار کے حامل انسان ہوں گے کیونکہ ان میں امی جان کی شخصیت کا عکس، ان کی تربیت کی وجہ سے ضرور شامل ہوگا۔ پھر مجھے اس بات کی بے انتہا خوشی تھی کہ رخصتی کے بعد مجھے ''اپنی امی'' کی کمی، امی جان کی وجہ سے محسوس نہیں ہوگی۔ آنے والا ہر لمحہ مجھے اپنے اندر ہزاروں، لاکھوں خوشیاں سمیٹے ہوئے نظر آتا تھا اور پھر یہ ہوا کہ ہماری شادی ہوگئی اور کچھ ہی دنوں میں، میں کینیڈا آ گئی۔ واقعی بلند ویسے ہی تھے جیسا میں نے کبھی رخصتی سے پہلے سوچا تھا یعنی اپنی امی کی تربیت کے ترجمان .....

ہماری شادی کو ابھی چار ہفتے بھی نہیں ہوئے تھے کہ امی جان کی بیماری کی خبر کسی قیامت کی طرح ہماری زندگی میں ایک شدید تکلیف دہ تبدیلی کا سبب بنی۔ بلند روتے جاتے تھے کبھی دیواروں پر سر مارتے کبھی بے بسی سے مجھے دیکھتے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ امی اس قدر کیوں بیمار ہوگئیں۔ ابھی کل ہی کی تو بات تھی وہ ہماری شادی میں کس قدر خوش تھیں۔ انہیں تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا پھر اچانک کس کی نظر لگ گئی۔ بلند فوراً پاکستان چلے گئے اور میں Winnipeq سے ٹورنٹو آ گئی اور پھر ہر ایک دن نمازوں اور دعاؤں کی نذر ہونے لگا۔ وہاں پاکستان میں جو کچھ ہو رہا تھا یہاں میں کینیڈا میں محسوس کرسکتی تھی اور پھر یہ ہوا کہ بلند امی کو لے کر کینیڈا واپس آ گئے۔ مجھے یاد ہے وہ وہیل چیئر پر تھیں، چہرے پر کمزوری اور خاصی پیلاہٹ تھی مگر آنکھوں میں وہی محبت کی قوس قزح چہرے پر ممتا اور ہونٹوں پہ مسکراہٹ۔ میرے اور فرحین کے سر پر ہاتھ پھیرا اور خیریت پوچھنے لگیں اس دن کے بعد کا ہر دن میری زندگی کے وہ دن ہیں۔ جنہیں میں چاہوں بھی تو شاید نہ بھلا سکوں۔

ہم لوگ دو دن میں ہی امی کو لے کر Cleveland چلے گئے اور وہاں ہسپتالوں میں امی کا علاج چلتا رہا۔ ان کا مرض شدت سے بڑھ رہا تھا اور وقت کے ساتھ ساتھ امی کی طبیعت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ کچھ ہی دنوں کے بعد ہم لوگ امی کو لے کر ٹورنٹو واپس آ گئے اور پھر یہاں

کے ڈاکٹروں سے ہسپتالوں میں امی کا علاج شروع ہو گیا۔ امی جان کبھی کبھی گہری نیند میں چلی جاتیں اور کبھی اچانک صحت مند نظر آتی تھیں۔ ایک امید اور ناامیدی کی کیفیت تھی جس میں پورا گھر گرفتار تھا۔ ڈیڈی ہمارے ساتھ تھے جن کی وجہ سے حوصلہ تھا۔ بیماری کی حالت میں امی کے مزاج کی کیفیت تمام تر تکلیف کے بعد بھی قابل فخر تھی۔

ان میں شاید بے انتہا برداشت اور صبر تھا۔ اپنی تکلیف کا اظہار کرنا ان کے مزاج کے خلاف تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی ہم لوگ امی سے پوچھتے کہ امی آپ کو کہیں تکلیف ہے تو بتایئے مگر ان کا ایک ہی جواب ہوتا ''نہیں میں بالکل ٹھیک ہوں'' اور اگر ان سے کھانے کا پوچھتے تو الٹا ہم سے ہی معلوم کرتیں کہ ''تم لوگوں نے کچھ کھایا یا نہیں؟'' اس حالت میں بھی میں نے ان میں تنک مزاجی یا چڑچڑاہٹ نہیں دیکھی۔ ان کی گفتگو میں ''آپ'' کا لفظ شامل تھا۔ پر اخلاق، تہذیب یافتہ جیسے ان کا مزاج ہی ان خصوصیات سے مل کر بنا ہو۔

ڈیڈی کے Cleveland آنے سے پہلے اور ٹورنٹو پہنچنے سے قبل بھی، جب بھی وہ جاگتیں ان کے پاس یہی سوال ہوتا کہ تمہارے ڈیڈی آ گئے کیا؟ انہیں ایئرپورٹ لینے کوئی گیا کیا؟ انہیں ہر حالت میں ڈیڈی یا ہماری فکر رہتی تھی۔ ایسی کتنی ہی باتیں ہیں جن کا تذکرہ کیا جا سکتا ہے اور امی جان کے بارے میں ایک عمومی رائے قائم کی جا سکتی ہے۔ مجھے یوں لگتا تھا کہ ان کی شخصیت میں چاندنی روشنی کی سی کیفیت ہے جو ہمارے گھر میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہے۔ جس میں سکون اور ٹھنڈک کا شدید احساس تھا۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ بلند کتنے خوش نصیب ہیں کہ انہیں امی جان جیسی ماں اور ڈیڈی جیسے باپ ملے۔ کاش مجھے کچھ اور دن امی جان کے ساتھ گزارنے کو ملتے اور ان کی موجودگی سے میں یہ اندازہ کر پاتی کہ کچھ لوگ اپنے اندر وہ کیا کشش رکھتے ہیں جس کی وجہ سے ہر شخص ان کو پسند کرنے لگتا ہے۔

آج امی ہمارے درمیان میں نہیں ہیں مگر میں اکثر سوچتی ہوں کہ کیا وہ واقعی نہیں ہیں؟

ان کی اعلیٰ تربیت کے تمام اثرات تو ان کے بچوں میں جھلک رہے ہیں، جاوداں باجی سے گڑیا باجی تک اور روشن بھائی سے بلند تک۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

جوہر انساں، عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

ڈاکٹر زرافشاں سید
کلیولینڈ۔امریکہ

میری ماں... میری آئیڈیل

اولاد اور ماں باپ کا رشتہ میں سمجھتی ہوں کہ ایک ایسا رشتہ ہے جسے الفاظ میں بیان کرنا بہت مشکل کام ہے کیونکہ بچوں کے دلوں میں ماں باپ کے لیے جو احساسات ہوتے ہیں اس کو بیان کرنے کے لیے دل، دماغ، زبان کسی بھی چیز کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ ان کا رواں رواں اپنے ماں باپ کی محبت سے بھرا ہوتا ہے۔ میں فلسفہ نہیں جانتی اور نہ ہی مجھے بہت اچھا لکھنا آتا ہے اس لیے جو لکھ رہی ہوں وہ ایک سیدھا سادہ مضمون ہے جس میں صرف امی ڈیڈی کے لیے محبت کا ایک چھوٹا سا اظہار ہے۔

میں اپنے گھر میں سب سے چھوٹی ہوں اس لیے میرے خیال میں میرا سب سے زیادہ نقصان یہ ہوا ہے کہ میں نے امی ڈیڈی کی زندگی کا وہ دور نہیں دیکھا جو میرے اور بہن بھائیوں نے دیکھا ہے ماں باپ کے ساتھ گزرا ہوا ایک ایک لمحہ بھی کم ہوتا ہے پھر بیٹی ہونے کے ناطے جب شادی ہوگئی تو مزید ان کے ساتھ رہنے کا وقت کم ہوگیا اور اب تو زندگی میں وہ خلا آ گیا ہے کہ جو کبھی پُر نہیں ہوسکتا۔ امی کی شخصیت ہمارے گھر میں ایسی تھی کہ جیسے سورج۔ جس کے محور میں سارے سیارے گردش کرتے ہیں اور اس سے روشنی حاصل کرتے ہیں۔ امی ایک بہت مضبوط شخصیت کی خاتون تھیں۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو اُس وقت میری دونوں بہنوں کی شادیاں ہوچکی تھیں اور مونا باجی کی شادی ہونے والی تھی۔ مجھے یاد ہے جب میں اسکول سے گھر آتی تھی تو امی مجھے بستر پر لیٹے ہوئے کوئی کتاب پڑھتی ہوئی ملتی تھیں امی کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ اور وہ ہر وہ کتاب

پڑھتی تھیں جس کی ڈیڈی تعریف کرتے تھے۔ انہوں نے ڈیڈی کے مزاج میں اپنے آپ کو بڑی اچھی طرح ڈھالا ہوا تھا۔ وہ اخباروں کے اداریے بڑے شوق سے پڑھتی تھیں۔ ان کا مطالعہ بڑا وسیع تھا۔ وہ ہر موضوع پر گفتگو کرنے کی اہلیت رکھتی تھیں۔ میں نے کبھی بھی امی کو عام خواتین والی گفتگو کرتے نہیں سنا۔ ہمارے گھر میں بھی ساس بہو کی لڑائی نہیں ہوئی۔ جب ثمینہ بھابھی شادی ہو کر آئیں تو اس وقت میں چھٹی جماعت میں تھی۔ میرے لیے تو وہ بڑی بہن تھیں اور امی نے بھی انہیں بیٹیوں سے بڑھ کر پیار کیا۔

جب میں چھوٹی تھی تو مجھے یاد ہے، امی مجھے بہت ہی چھوٹی چھوٹی لیکن اصول باتیں سمجھاتی تھیں۔ مجھے کہتی تھیں کہ بیٹا کلاس میں ہمیشہ آگے رہو۔ اپنے آپ کو کبھی کمتر مت سمجھنا۔ جبھی تم کامیاب ہوگی۔ امی ڈیڈی نے گھر میں بچوں کے درمیان کوئی communication gap نہیں رہنے دیا۔ ہمیں کوئی بھی مسئلہ امی ڈیڈی سے کہنے میں کبھی کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی اور وہ ہماری بات بڑے غور سے سنتے تھے اور پھر ہمیں سمجھاتے تھے۔ انہوں نے ایک اصول اپنے گھر میں یہ بنا رکھا تھا کہ جواب میں سمجھتی ہوں کہ بہت زیادہ اہم ہے۔ وہ یہ کہ اپنے ماضی کو اور اس وقت کو جو انہوں بہت ہی زیادہ struggle میں گزارا اس کو ہمارے سامنے بیان کرنا جس سے ان کے ایک ایک بچے میں یہ احساس پیدا ہوا کہ ہمارے ماں باپ نے بڑی محنت سے اپنی زندگی بنائی کیونکہ جب میں پیدا ہوئی تھی تو اس وقت ہمارے گھر کے حالات کافی بہتر ہو چکے تھے اور گھر میں گاڑی، ٹی وی اور دوسری ضروریات کی چیزیں آچکی تھیں۔ تو ظاہر ہے کہ اگر امی میرے سامنے اپنے ابتدائی دور کا ذکر نہیں کرتیں تو مجھے پتہ بھی نہیں چلتا کہ میرے ماں باپ کتنے selfmade ہیں۔ امی نے ہمیشہ ہم لوگوں کو سچ بولنے کی تلقین کی۔ ہمیں اندر سے اتنا مضبوط بنایا کہ ہمیں اپنے آپ کو لوگوں کے درمیان کھڑا رکھنے کے لیے کبھی جھوٹ کا سہارا لینا نہیں پڑا۔ امی کی نظر بچوں کی شخصیت کے ہر پہلو پر تھی۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں میٹرک میں تھی تو امی نے بلند بھیا کو پابند کیا کہ

وہ میری پڑھائی پر نظر رکھیں اور وہ ان سے میری progress پوچھتی رہتی تھیں اور سچ یہ کہ بھیا نے بھی امی کے بیٹے ہونے کا ثبوت دیا اور بہت ہی seriously میری پڑھائی میں دلچسپی لی۔ امی نے تعلیم کے ہر دور میں میری بہت حوصلہ افزائی کی۔ میری عادت رات کو بہت دیر تک جاگ کر پڑھنے کی تھی اور مجھے یاد ہے کہ امی کہا کرتی تھیں کہ بیٹا جب تم پڑھتی ہو تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ میں پڑھ رہی ہوں اور دیکھنا کہ جب تم ڈاکٹر ہو گی تو مجھے لگے گا کہ میں ڈاکٹر بن گئی ہوں۔ امی کا خواب تھا کہ اُن کی کوئی بیٹی medicine پڑھے اور امی سے مجھے انٹر میڈیٹ کے زمانے میں ڈانٹ بھی بہت پڑتی تھی۔ کام نہ کرنے پر ..... وہ دراصل اپنے بچوں کی مکمل شخصیت چاہتی تھیں۔ امی کو ہر وقت یہ فکر بھی لگی رہتی تھی کہ کہیں گھر کے کاموں میں پیچھے نہ رہ جاؤں۔ انٹر کے بعد چھٹیوں میں امی نے مجھے کھانا پکانا بھی سکھا دیا تھا اور آج میں سوچتی ہوں کہ امی نے کتنا اچھا کیا تھا۔ کیونکہ وہ آج میرے کام آ رہا ہے۔ جس دن میرا انٹر کا رزلٹ آیا، وہ دن میں کبھی نہیں بھول سکتی۔ امی کتنی خوش تھیں اور اُنہوں نے مجھ سے پہلا سوال یہی کیا تھا کہ بیٹا میڈیکل کالج میں داخلہ مل جائے گا نا؟ میڈیکل کی تعلیم کے زمانے میں بھی امی نے میری ہمیشہ حوصلہ افزائی کی اور ساتھ ساتھ اتوار کا دن میرے لیے مقرر کر دیا۔ مجھے ذرا سی دیر کالج سے آنے میں ہوتی تو وہ مجھے دروازے میں کھڑی ہوئی ملتیں تھیں اور میں امی سے کہتی تھی کہ آپ اتنی جلدی کیوں پریشان ہو جاتی ہیں لیکن اپنے اس سوال کا جواب اب مجھے مل گیا ہے کہ جب میں دو بچوں کی ماں بن گئی ہوں کہ ماں تو اتنی حساس ہوتی ہے کہ جب بچہ کروٹ بدلتا ہے تو اُس کی آنکھ کھل جاتی ہے۔

امی کی شخصیت کا ایک بہت ہی important پہلو جو اب میں بیان کرنے جا رہی ہوں وہ اکثر خواتین میں lack کر جاتا ہے۔ وہ ہے ددھیال اور ننھیال کے درمیان توازن ہمارے تو سارے رشتہ دار انڈیا میں ہیں صرف ایک ماموں کا گھر یہاں پاکستان میں ہے لیکن امی نے اتنی دور رہ کر ہمارے دلوں میں ددھیال اور ننھیال کی محبت کوٹ کوٹ کر بھر دی۔ مجھے نہیں یاد کہ

امی نے کبھی ہمارے سامنے ددھیال اور ننھیال میں فرق کیا ہو۔ عام طور پر دیکھا جاتا ہے کہ خواتین زیادہ تر اپنے میکے کو ترجیح دیتی ہیں لیکن امی نے اس معاملے میں بڑا خوبصورت توازن رکھا اور ہمارے دلوں میں ددھیال کے لیے بہت زیادہ محبت پیدا کی۔ مجھے اس بات کا اندازہ اس وقت ہوا جب میں ڈیڈی کے ساتھ انڈیا گئی وہاں جا کر یہ احساس ہوا تھا کہ واقعی ہم لوگ اپنی ددھیال سے زیادہ attach ہیں۔ ننھیال سے تو محبت ہے ہی اور ان کے دلوں میں بھی امی کے لیے بہت زیادہ محبت اور عزت ہے جو امی نے اتنی دور رہ کر بھی قائم رکھی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ دادی اماں نے مجھے خود کسی بات پر کہا تھا کہ ''جانی بیگم نے اپنے بچوں کی تربیت بہت اچھی کی ہے'' اور وہ امی کو بہت یاد کرتیں تھیں۔ امی نے ہمارے ماموں جان کے گھر سے بھی بہت اچھے تعلقات رکھے اور یہی وجہ ہے کہ تسنیم باجی ہماری بھابھی بنیں۔ یہ اپنی محبتوں کا نتیجہ ہے۔ امی نے یہی تعلیم اپنے سارے بچوں کو دی اور اُنہوں نے اپنی ان ہی خوبیوں کی وجہ سے اپنی جگہ لوگوں کے دلوں میں بنائی یہ امی ہی کی تربیت ہے کہ آج اُن کے سارے بچے اپنی اپنی زندگی بہت خوش اور مطمئن گزار رہے ہیں۔

جب میری شادی ہو رہی تھی، امی تھوڑی خوفزدہ تھیں۔ اُن کو یہ ڈر تھا کہ نجانے میری یہ بیٹی گھر کیسے سنبھالے گی کیونکہ سب سے چھوٹی ہونے کی وجہ سے میرے اندر تھوڑا الا اُبالی پن تھا اور Medicine کی تعلیم کی وجہ سے زیادہ گھر کے کاموں میں حصّہ نہیں لے پاتی تھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ جب امی میرے پاس امریکہ آئیں تو اُن کو میری گھر داری دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ کہتے ہیں نا کہ ماں سلیقہ مند ہو تو بیٹیاں بھی سلیقہ مند ہو جاتی ہیں۔ بس کچھ ایسا ہی تھا کہ غیر محسوس انداز میں، میں نے امی کی سلیقہ شعاری اور ان کی شخصیت کو تھوڑا بہت adopt کر ہی لیا تھا جو میرے کام آ رہا ہے۔ امی میرے پاس امریکہ تین مرتبہ آئیں اور اُن کے ساتھ یہاں پر بہت ہی اچھا وقت گزرا۔ اُن کو یہاں کے لوگوں کی خوش اخلاقی بہت اچھی لگتی تھی لیکن ساتھ وہ یہ بھی کہتیں

تھیں کہ پاکستان کی بات ہی اور ہے۔ امی نے امریکہ کے بہت سارے شہر دیکھے۔ اُنہوں نے نیویارک، نیوجرسی، شکاگو، واشنگٹن، میری لینڈ، کلیولینڈ، بالٹی مور، کولمبس، سن سائی، راچسٹر، ڈیٹر ایٹ اور بہت سے چھوٹے بڑے شہر گھومے۔ اس کے علاوہ کینیڈا میں ٹورنٹو اور ونڈسر دیکھا۔ وہ یہاں پر بھی لوگوں کو بہت عزیز تھیں کیونکہ ان کا انداز ہی اتنا مشفقانہ ہوتا تھا کہ جتنا لوگ ڈیڈی کو چاہتے تھے اُتنا ہی امی کو بھی پسند کرتے تھے۔

آخر میں میں بس یہی کہوں گی کہ امی کی شخصیت ایک مکمل عورت کی شخصیت تھی اور وہ انتہائی نرم دل کی مالک تھیں۔ انہوں نے کبھی کسی کے لیے غلط نہیں سوچا۔ وہ بہت ہی مثبت سوچ رکھنے والی خاتون تھیں۔ امی کی ذات سے دوسروں کو فائدہ ہی پہنچتا تھا۔ انہوں نے کبھی کسی کا نقصان نہیں کیا اور اللہ تعالیٰ بھی اپنے بندوں سے یہی چاہتا ہے۔ ''اعمال کا دارومدار نیت پر ہے'' اور مجھے پورا یقین ہے کہ جس طرح امی نے ایک کامیاب زندگی گزاری ہے اللہ تعالیٰ اُنہیں آخرت میں بھی کامیاب کریں گے۔ آمین۔

Dr. Wasim Khan MD

Elegant personality

I feel very honored and privileged to write about my late mother in law. I met her very first time when she came here at Baltimore, USA in 1997. It was really a great pleasure to meet a person like her. She had a calm and elegant personality. Her conversation was well balanced and to the point. She was considerate and sensitive enough to care the tenderness of each relationship belonged, just not to her family but also to the family friends and others. She visited us couple of times after I got married with her daughter. She has inherited her politeness and respect of others in her daughter. Being her husband a great and famous "Poet" in Pakistan, who is also recognized and well respected abroad, she never took this granted. Indeed she was humble and maintained high etiquette. There is so much that could be written about her but I think words can not express well my thoughts about her. I will wrap up by saying that she was a person you expect will never harm you or any body in any way.

Wasim Khan, MD
Pediatric Cardiologist
Rainbow Babies and Children Hospital
Cleveland, OH.

United States of America.

هم کاروان

راغب مراد آبادی
(کراچی)

بیگم حمایت علی شاعر

(رباعیات)

تھیں جامعِ الاوصاف جو خاتون عظیم
اب خیر سے ہیں، ساکنِ جناتِ نعیم
شاعر کی شریکِ زندگی تھیں خوش بخت
بنتِ عبدالغفور، معراج نسیم

شاعر کا تھا دل، مامنِ معراج نسیم
تازیست رہا، گلشنِ معراج نسیم
اللہ کی رحمت کا ہے سایہ اُس پر
کینیڈا میں ہے، مدفنِ معراج نسیم

اولاد پہ، شفقت کی سند ہیں معراج
انعامِ خداوندِ صمد ہیں معراج
اب عالمِ رنگ و بو ہے اُن سے محروم
آسودۂ آغوشِ لحد ہیں معراج

ہے قربِ خدا، حاصلِ معراج نسیم
بے شک تھی یہی منزلِ معراج نسیم
کاشانۂ شاعر میں اندھیرا نہ ہو کیوں
گل ہو گئی شمعِ دلِ معراج نسیم

شاعرؔ کا جمالِ فن تھیں معراج نسیم
رشکِ لعلِ یمن تھیں معراج نسیم
کیوں یاد میں اُن کی نہ بہاؤں آنسو
راغبؔ! میری بہن تھیں معراج نسیم

بیٹے اور بیٹیاں نہ کیوں ہوں غمگین
ماں کی موجودگی تھی وجہِ تسکین
دیدارِ بروزِ حشر اب اُن کا ہوگا
اللہ کے فضل سے ہے، اِس کا تو یقین

قاضی رئیس (قمر)
(اورنگ آباد۔ انڈیا)

سانحۂ جاں سوز

(اپنی خالہ، معراج نسیم کی وفات پر)

دھرتی پہ سلطنت ہے، تو افلاک پہ گزر
نائب ولے ہے تیرا یہ انسان بے بسر

فانی ہر ایک چیز، تری ذات کے سوا
دعوے تمام جھوٹ، تری بات کے سوا
حکمت تری عظیم، کسے تاب اُف مگر
کیا غم نہیں تھا اور اِن آفات کے سوا

وہ غم ملا ہے آج کہ دل چُپ ہے، لب خموش
جذبے تمام سرد ہیں، ماحول سب خموش
سانسیں اُلجھ رہی ہیں تو بے ربط ہے خیال
دھڑکن نہ جانے دل کی یہ ہو جائے کب خموش

وہ جسم و جاں کہ جس میں، مری ماں کی تھی شبیہہ
مسرور جس کے دَم سے تھے، بھائی بہن سبھی
وہ چہرہ اب نہیں، پہ ہر اک آن یوں لگے
بیٹھی تھیں میرے ساتھ کہ اُٹھ کر گئیں ابھی

دیتی رہیں دعائیں مجھے خالہ عمر بھر
آساں مری حیات تھی، جیتا تھا بے خطر
سایہ ہٹا جو سر سے تو معلوم یہ ہوا
کہتے ہیں کس کو دھوپ، کسے سایۂ شجر

یہ سانحہ جھنجھوڑ دیے جس نے دل، دماغ
یہ سانحہ کہ جس سے ہرے ہیں جگر کے داغ
یہ سانحہ کہ جیسے ہو، اک روشنی کی موت
یہ سانحہ کہ جس نے سدا گُل کیے چراغ

اس درد کا طبیب نہیں، عصر کے سوا
چارہ نہیں ہے اور کوئی، صبر کے سوا

(مطبوعہ ''کتاب نما'' دہلی۔ مارچ ۲۰۰۳ء)

قاضی رئیس میرے خالہ زاد بھائی ہیں اورنگ آباد (مہاراشٹر) میں رہتے ہیں بہت اچھے شاعر ہیں ان کے دوہوں کا ایک مجموعہ ''آہٹ'' کے نام سے شائع ہو چکا ہے ان کی عرفیت ''قمر'' ہے اس لئے ہم انہیں ا۔ انہیں ''قمر بھائی'' کہتے ہیں (جاوداں)

خواجہ معین الدین
(کراچی)

کُل نفسٍ ذائقۃ الموت

بچپن کے دوست اور ساتھیوں میں سب سے عزیز ساتھی حمایت علی شاعر کی رفیقہ حیات کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہوئے تقریباً ایک سال ہو رہا ہے لیکن یوں لگتا ہے کہ کل کی ہی بات ہے۔ وقت گزر جاتا ہے لیکن یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔ میرے لئے وہ بھاوج ہی نہیں بلکہ ایک چھوٹی بہن کی حیثیت رکھتی تھیں۔ ان کے لیے آج بھی یہ بات ماننے کو طبیعت نہیں چاہتی ہے کہ وہ اب ہمارے ساتھ نہیں۔

معراج نسیم صاحبہ کا انتقال نہ صرف حمایت اور ان کی اولاد کے لئے ایک بڑا صدمہ ہے بلکہ ہم تمام عزیز و اقارب کے لئے بھی شدید رنج و غم کا باعث ہے۔ وہ ایک متحمل مزاج اور پڑھی لکھی ہنس مکھ خاتون تھیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بڑی ثابت قدمی اور مستقل مزاجی سے اپنے رفیقِ حیات کا ہر اچھے اور برے وقت میں ساتھ دیا اور اپنی زندگی کا ہر لمحہ ہر طرح سے اپنے شوہر اور بچوں کے لئے وقف کر دیا اور آخر وقت تک اپنی اس روش پر قائم رہیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحومہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین

یمین النساء معین
(کراچی)

معراج بھابھی

معراج بھابھی اور ہم سب نند بھاوجوں نے ایک بڑا وقت ساتھ گزارا۔ اب جبکہ وہ ہم میں نہیں ہیں تو بڑا عجیب لگتا ہے کہ وہ ہم میں نہیں ہیں اور اس بات سے دل پانی پانی ہو جاتا ہے۔

ان کی بہت ساری باتیں ایک ایک کر کے یاد آتی ہیں وہ ہمیشہ ایک وسیع النظر اور مددگار خاتون رہیں۔ جہاں وہ اور دوسرے گھریلو معاملات میں میری بہترین مشیر تھیں وہاں وہ میری خوش دامن صاحبہ کا خیال رکھنے میں بھی میری مددگار رہیں۔ معراج بھابھی ایک منفرد شخصیت کی مالک تھیں۔ جہاں ان کی ذات میں بڑی خوبیاں تھیں وہاں ایک بڑا وصف ان کی مزاج کی نرمی تھی وہ بڑوں اور چھوٹوں کے ساتھ نہایت ہی محبت اور شفقت سے پیش آتی تھیں۔ بہرحال انہیں جتنا بھی یاد کیا جائے کم ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین

غلام دستگیر
(کراچی)

آہ!

میری بہن معراج سراپا خلوص و محبت کی پیکر ہم سے جدا ہو گئی۔ آنکھیں پرنم اور دل افسردہ و پر ملال ہے۔ جب لکھنے بیٹھا ہوں تو ہاتھ کانپ رہا اور دل بے قرار ہے۔ ماضی کے مناظر نظروں کے سامنے آ گئے۔ خالہ کے الفاظ کانوں میں گونجنے لگے۔ ''دستگیر میاں! جانی بیگم کا خیال رکھنا'' چنانچہ ہمارے ہمراہ پاکستان پہنچیں۔ یہاں پڑوس میں ساتھ ساتھ رہے۔ یہ ہجرت کا زمانہ ترک وطن کا عذاب بھی تھا۔ اس دور میں ہندوستان میں رہنا مشکل اور پاکستان میں جینا مشکل تھا کہ ''چمن میں آہ کیا رہنا، ہو جو بے آبرو رہنا'' ایسے مشکل وقت میں جس پامردی سے حالات کا مقابلہ عورتوں نے کیا وہ لائق تحسین ہے۔ خاص طور پر معراج نے نہ صرف اپنے شوہر کی ہمت افزائی کی بلکہ اپنی رشتے دار بھائی بہنوں کی ہمدردی اور ہنمائی بھی کی، بچوں کی پرورش اور نہ صرف بہتر تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا بلکہ ان کو کامیابی و کامرانی کے راہ پر لگایا۔ سچ تو یہ ہے معراج نے ایک شاعر کو معراج پر پہنچا دیا۔

اللہ جنت الفردوس عطا فرمائے۔ آمین

قمرالنساء (گوری خالہ)
(کراچی)

میری اچھی بھابھی

تم کیوں ہم کو چھوڑ کر چلی گئیں ،تمہارے بغیر گھر سونا سونا ہے اور بھائی تنہا اور اداس ہے۔ بیٹے ،بیٹیاں ، بہوئیں اور پوتے ، پوتیاں ،نواسے ،نواسیاں غمزدہ ہیں۔ آخر ان کی شادیوں کی بات کون طے کرے گا۔ مہندی کی تقریب میں کون پیش پیش ہوگا۔ شادی اور ولیمہ میں کون استقبال کرے گا۔ اب آ بھی جاؤ نا!

پھر دل نے کہا۔ نادان وہ ایسی جگہ سو رہی ہیں جہاں شور قیامت بھی جگا سکتا نہیں۔

خدا انہیں جنت نصیب کرے آمین!

بیگم قاضی شفیع الدین فرحت
(کراچی)

بھابھی

بھابھی ہم میں نہیں ہیں، یقین نہیں آتا کہ وہ ہم کو یوں روتا چھوڑ کر چلی جائیں گی۔
آج جب میں گزرے دن یاد کرتی ہوں تو دل بھر آتا ہے اور بھابھی کا مسکراتا چہرہ سامنے آ جاتا ہے وہ کس قدر ملنسار، خوش مزاج اور ہنس مکھ تھیں ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں جس قدر سخت دور سے ہم لوگ گزرے، وہ اللہ تعالیٰ کسی کو نہ دکھائے۔ انہوں نے بڑی محنت سے اپنے بچوں کی تعلیم وتربیت کی اور انہیں معاشرے میں ایک اعلیٰ مقام دلایا۔ اللہ کا شکر ہے کہ آج ان کے سب بچے معاشرے کے لئے موثر اور باعث نمونہ ہیں۔ بھابھی اور میں نے بہنوں کی طرح زندگی گزاری اور ہماری زندگی غربت کے مسائل سے ضرور گزری مگر بڑی مطمئن زندگی تھی۔

میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھابھی کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور حمایت بھائی ان کے بچوں اور تمام عزیز و اقارب کو صبر و جمیل عطا فرمائے۔ آمین

خواجہ نصیرالدین
(کراچی)

جانی بیگم

یاد ماضی کی تمناؤں کے نقشے بھیجوں
اپنے اشکوں سے کوئی لکھ کے دعائیں بھیجوں

جانی بیگم کے لئے میں کیا لکھوں میرا دل ساتھ نہیں دے رہا ہے ان کی موت میرے لئے ہم سب کے لئے کسی سانحہ سے کم نہیں۔ وہ ہماری زندگی میں ایک خلا چھوڑ گئی ہیں۔ وہ وقت میں کیسے بھولوں جو ہم دونوں نے ساتھ گزارا ہے۔ بچپن سے لے کر اب تک ہر یاد تر و تازہ ہے وہ اپنی بھاوج (عجیب النساء) سے بہت محبت کرتی تھی۔ دونوں ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہتے تھے ایک ہفتہ اگر ہم دونوں نہیں گئے تو فون کرتیں اور اپنی بھاوج سے کہتیں ''تم لوگوں کو یہ بھی توفیق نہیں ہوتی کہ فون کر کے ہماری خیریت معلوم کر لیں'' پھر شاعر صاحب کو لے کر ہمارے گھر آ جاتیں اور سارے گلے ختم ہو جاتے، بزرگوں سے میری شکایت کرنے اور ان سے ڈانٹ کھلانے میں اس کو بڑا مزہ آتا تھا۔ ہم لوگ اکثر لڑتے تھے اور چند ہی گھنٹے گزرنے نہیں پاتے کہ پھر بات چیت ہو جاتی۔ عجیب رشتے، عجیب محبتیں تھیں ہماری، اب میں اسے کہاں ڈھونڈوں؟

میر عنایت علی
(اورنگ آباد) انڈیا

میری بھابھی

باوجود اس حقیقت کے کہ یہ دنیا اور یہاں کی ہر چیز فانی ہے۔ انسانی زندگی میں چند رشتے ایسے ہوتے ہیں کہ ان کی جدائی کا زخم کبھی بھرنے نہیں پاتا۔ یادوں کے سفینے جب چلنا شروع کر دیتے ہیں تو کتنا ہی ضبط کریں آنکھ سے آنسو ٹوٹ ہی پڑتے ہیں۔ یکم جنوری ۱۹۶۹ء میں اپنے والد (سید تراب علی صاحب) کی وفات کے بعد جن دو شفیق ہستیوں کی اچانک وفات نے مجھے ایک دم سے بے سہارا کر دیا وہ میری والدہ (سیدہ حور النساء بیگم) کی ۷/ مئی ۲۰۰۲ء کو اچانک وفات اور اس کے چھ ماہ کے اندر ہی میری بھابھی معراج نسیم صاحبہ (اہلیہ حمایت علی شاعر) کی کینیڈا کے شہر ٹورنٹو میں (جہاں ان کا بیٹا ڈاکٹر بلند اقبال انہیں علاج کے لئے لے گیا تھا) ۲۱/ نومبر ۲۰۰۲ء کو انتقال کر جانا ہے۔ ہم لوگوں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ہماری بھابھی جنہیں ہم اپنے بھائی کی عرفیت کی مناسبت سے ''بھاوج پاشا'' کہتے تھے، یوں یکا یک ہم سب کو چھوڑ کر چلی جائیں گی۔

آج جب میں اپنے ماضی کی طرف نظر دوڑاتا ہوں تو میرے ذہن میں آج سے ۵۴ سال قبل کی ایک دھندلی سی تصویر ابھرتی ہے جب ہمارے گھر میں ایک خوبصورت سی لڑکی بیاہ کر آئی تھی اور جو ہر روز علی الصبح میری والدہ کے بستر کے قریب بیٹھی رہتی کہ جب میری والدہ نیند سے بیدار ہوں تو ان سے پوچھتی کہ ناشتہ میں کیا پکانا ہے۔ میری والدہ ہر روز انہیں ٹوکتی رہتیں کہ بیٹی اتنی صبح مت اٹھا کرو لیکن وہ کبھی مانتی ہی نہیں تھیں۔ میں اس وقت تیسری جماعت میں پڑھتا تھا اور اپنے بھائی بہنوں میں بڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اپنی خوبیوں اور اخلاق کی بنا پر وہ بہت جلد پورے

خاندان کی چہیتی بن گئیں ۔ ہر کوئی ان کی تعریف کرتا تھا۔

وہ دور بڑا ہی پر آشوب تھا ۔ برصغیر کی تقسیم ، نئے ملکوں کا وجود میں آنا، ایک بڑے پیمانے پر انسانوں کی ہجرت ، بے روزگاری اور ایک غیر یقینی صورتحال ۔ سن ۱۹۴۸ء میں میرے والد کو قبل از وقت ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ کوئی متبادل ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ ایک بڑا کنبہ اور بے پناہ ذمہ داریاں ، جو کچھ تھا وہ والد کی قلیل پنشن ۔ بھائی (حمایت علی شاعر) ان دنوں حیدر آباد میں ریڈیو پر ملازم تھے ۔ پھر ایک دن اطلاع ملی کہ انہیں بھی ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا ۔ یہ پریشانی صرف ہمارے گھر کی نہیں تھی بلکہ کئی خاندان ایسے حالات سے دوچار تھے ۔ پڑھے لکھے نوجوان دھڑا دھڑ ہجرت کر رہے تھے اور گھروں میں صرف بوڑھے ماں باپ اور چھوٹے بھائی بہن رہ گئے تھے ۔ پھر ایک وقت ایسا آیا کہ میرے بھائی اور ایک پھوپھی زاد بھائی قاضی شفیع بھی ہجرت کے لئے مجبور ہو گئے ۔ ان کے چلے جانے کے ایک سال کے بعد ہی میری بھابھی بھی اپنی ایک بچی کو لے کر بحری جہاز سے کراچی چلی گئیں ۔ میرے والد انہیں بمبئی تک چھوڑنے گئے تھے اور جب وہ واپس آئے تو ان کا افسردہ چہرہ آج بھی میری نگاہوں کے سامنے ہے کیونکہ وہ ہمارے گھر کے بکھرنے کا آغاز تھا جس کی نیو اس دن رکھی جا چکی تھی ۔

اس کے بعد وہ طویل دور شروع ہوا جب خط و کتابت ہی ایک ذریعہ تھی ۔ بھائی کے علاوہ بھابھی کے خط بھی پابندی سے آتے رہتے ۔ میں اس وقت پانچویں جماعت میں آ چکا تھا اور اس فکر میں رہتا تھا کہ جلد دسویں تک پڑھائی مکمل کر لوں ۔ اگر پاس نہیں بھی ہوا تو کوئی نہ کوئی چھوٹی سی نوکری تو مل ہی جائے گی ۔

پریشانیوں کے دور میں جب انسان کو ہر طرف ناامیدی اور بے بسی کے سائے گھیرے رہتے ہیں، اس وقت خلوص ، محبت اور ہمت کے دو لفظ بھی اپنی جگہ خاص اہمیت رکھتے ہیں ۔ ان سے زندگی میں حوصلہ پیدا ہوتا ہے ۔ آگے بڑھنے کی خواہش پروان چڑھتی ہے ۔ ایسا ہی کچھ میرے

ساتھ ہوا۔ میری طالب علمی کے دور میں میری بھابھی کے شفقت بھرے خطوط نے مجھے زندگی میں بڑا حوصلہ دیا۔ وہ ان کا مجھ پر احسان تھا۔ ۱۹۶۴ء میں جب میں نے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی تو اس وقت انہوں نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ آج ان کا ایک خواب پورا ہوا ہے۔

زندگی میں اچھے یا برے سب دن گذر جاتے ہیں لیکن ان کی یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔ مجھے اس حقیقت کا شدت سے احساس ہے کہ میری بھابھی نے اپنی زندگی میں بہت سی مشکلات کا سامنا کیا ہے، برے دن بھی دیکھے لیکن کبھی بھی انہوں نے شکوہ یا شکایت نہیں کی۔ نہ میکہ والوں کو لکھا نہ سسرال والوں کو خبر دی۔ چپ چاپ خاموشی سے انہوں نے ہر تکلیف کو برداشت کیا۔ یہ ان کی شخصیت کا سب سے قابل تعریف پہلو ہے۔ اپنے شوہر کے ساتھ بڑی ہمت سے انہوں نے زندگی کے مشکل حالات کا مقابلہ کیا۔ گھر کی ذمہ داریوں کو خوش اسلوبی سے نبھایا۔ ان کا سب سے بڑا کارنامہ نامساعد حالات میں اپنے بچوں کی تعلیم کی طرف توجہ تھی۔ انہوں نے بچوں کو خوب پڑھایا۔ ان کی اچھی تربیت کی۔ آج میرے بھتیجے، بھتیجیوں نے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کی، جو کامیابیاں انہیں ملی ہیں اور زندگی میں آج وہ جس مقام پر ہیں اسے دیکھ کر بے حد خوشی ہوتی ہے۔ اس کا بڑا کریڈیٹ میری بھابھی کو جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج سے پچاس سال قبل میرے والد مرحوم نے اپنی اولاد کی تعلیم کے بارے میں جو خواب دیکھے تھے یہ بچے اس کی تعبیر ہیں۔

میرے بھائی نے زندگی میں جو مقام حاصل کیا، جو شہرت اور عزت حاصل کی، اس میں جہاں ان کی انتھک محنت شامل ہے وہیں دوسری طرف اس کے پیچھے میری بھابی کی ذات تھی، جنہوں نے زندگی کی ہر گھڑی میں، ہر سکھ دکھ میں، اپنے شوہر کا ساتھ دیا اور رفاقت کا پورا فرض ادا کیا۔ مجھے اپنے بھائی پر رشک ہوتا ہے کہ پروردگار نے انہیں اتنی اچھی شریک حیات دی تھی جس نے زندگی کی آخری سانس تک انہیں بھرپور محبت دی۔

اپنی بھابی کی کون کونسی خوبیوں کا ذکر کروں۔ وہ ایک بہت نیک دل خاتون تھیں۔

شائستہ، با اخلاق، خاندان کے ہر فرد سے خلوص کا برتاؤ، دوسروں کے دکھ درد میں شریک، ایثار، بزرگوں کا احترام، چھوٹوں سے شفقت، سادہ رہن سہن اور ہمیشہ مسکراتا چہرہ۔ شاید ہی کسی نے انہیں کبھی غصے میں دیکھا ہو۔ ان کے جیسی کوئی بہو شاید ہی اب ہمارے گھر میں آئے۔ وہ تو ہمارے گھر کا ایک روشن چراغ تھیں۔ فخر خاندان تھیں۔ میرے لئے تو وہ خلوص، محبت اور شفقت کا ایک پیکر تھیں۔ کبھی بھی انہوں نے مجھے اپنا دیور نہیں سمجھا بلکہ ایک بیٹے کی طرح مجھے چاہا اور میری بیوی کو اپنی بہو..... وہ اسے بھی اپنی بیٹیوں کی طرح چاہتی تھیں۔ میرا بیٹا نشید جب ڈاکٹر ہوا تو انہوں نے کہا ''آج میرا دوسرا خواب پورا ہوا ہے'' یہ میری بدقسمتی ہے کہ میں اس محبت اور شفقت سے اب ہمیشہ کے لئے محروم ہو چکا ہوں۔

اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور اپنے وطن سے دور ٹورانٹو کے ایک قبرستان میں وہ اب ابدی نیند سو رہی ہیں۔ میں ان کے جنازے کو کاندھا بھی نہیں دے سکا۔ پروردگار سے جو بڑا رحمٰن اور رحیم ہے یہی دعا کرتا ہوں کہ وہ میری بھابی کی مغفرت فرمائے (آمین)

منظور احمد
(کراچی)

آپا بیگم

میری بہن مجھ سے پانچ سال بڑی تھیں۔ اب وہ ہم میں موجود نہیں ہیں۔ محترمہ معراج نسیم صاحبہ علاج کی غرض سے کینیڈا گئیں اور وہاں ٹورانٹو میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ مجھے اپنی بہن بہت یاد آتی ہیں کیونکہ ہمارا بچپن ساتھ گزرا ہے، ویسے میرے والد صاحب کو یہ بیٹی بہت عزیز تھی اور وہ ہمیشہ ان کی ذہانت کی تعریف کیا کرتے تھے بہن معراج نسیم صاحبہ کو پڑھنے لکھنے کا بہت شوق تھا چنانچہ انہوں نے اپنے اس شوق کو جاری رکھا اور ادیب فاضل کیا جو بی اے کے برابر ہوتا ہے (مگر سنا ہے اس کے نصاب میں ایم اے کی کتابیں ہوتی ہیں) بہن بھائیوں کو بے شک ایک دوسرے سے محبت ہوتی ہے۔ مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے

میرے والد صاحب ضلع عثمان آباد کے شہر لاتور میں ہائی اسکول کے ٹیچر تھے۔ بہن معراج نسیم صاحبہ بھی گرلز ہائی اسکول میں ٹیچر تھیں اور میں پرائمری اسکول کا طالب علم تھا۔ ہم سب کی بہت اچھی زندگی گزر رہی تھی کہ اچانک انڈیا نے دکن پر حملہ کر دیا۔ لاتور چونکہ رضا کاروں کا گڑھ تھا چنانچہ ہندوستانی فوج کے داخل ہوتے ہی ہم وہاں سے نکل گئے اور کسی دوسرے دیہات میں ٹھہر گئے لیکن کچھ عرصہ بعد وہاں بھی انڈین فوج نے دھاوا بول دیا چنانچہ بغیر ساز و سامان کے صرف بدن کے کپڑوں کے ساتھ ہم بھاگ کھڑے ہوئے۔ لوگ اپنی جان بچانے کے لئے جس کو جہاں سوجھتی جا رہے تھے۔ ہمارے لئے وہ علاقہ بالکل نیا تھا۔ راتوں رات دیہات سے نکلنے کے بعد سب سے چھپ کر پیدل، پہاڑوں، کھیتوں سے گزر کر چلتے رہے۔ یقین مانیے بیل بنڈی

(بیل گاڑی) کا تقریباً آٹھ گھنٹے کا راستہ پیدل، چار دن میں پورا ہوا۔ اس پیدل سفر کے دوران سب سے زیادہ نڈھال میں ہو گیا تھا۔ اس وقت میری عمر نو یا دس سال تھی اور میری بہن معراج نسیم صاحبہ کی عمر ۱۵ یا ۱۶ سال تھی۔ پیدل چلنے سے ہم سب کے پیروں میں چھالے اور زخم پڑ گئے تھے۔ میری یہ حالت، میری بہن سے نہیں دیکھی گئی چنانچہ انہوں نے مجھے اپنی پیٹھ پر بٹھالیا اور میرا بوجھ اٹھائے دن کی تیز دھوپ اور اندھیری رات میں مسلسل چلتی رہیں، یہ وہ کیفیت تھی جس نے میرے دل میں ان کی محبت کو روشن اور شدید کر دیا۔ چار دن کے سفر میں ہمیں کھانے کو کچھ نہیں ملا (ندی نالوں کے پانی کے سوا) میری بہن نے خود تکلیفیں اٹھائیں اور مجھے آرام پہنچایا کیونکہ میں مزید پیدل نہیں چل سکتا تھا۔ اس طرح ہم ریلوے اسٹیشن پہنچے اور پھر ریل کے ذریعے حیدرآباد پہنچے جہاں سے ہماری سکون کی زندگی کا آغاز ہوا۔ اب تکلیف، پریشانی و خوف کے دن ختم ہو چکے تھے۔ میرے والد صاحب عثمانیہ یونیورسٹی میں ''مجلّہ عثمانیہ'' کے منتظم کی حیثیت سے ملازم ہو گئے ہم نے باقی وقت حیدرآباد میں بہت اچھا گزارا۔ کہنا یہ ہے کہ بہن بھائی کے رشتے بہت عزیز اور محبت بھرے ہوتے ہیں انہوں نے اس رشتے کو استوار رکھنے کی خاطر میری بیٹی تسنیم ہاجرہ کو اپنی بہو بنالیا میرا داماد اوج کمال بھی بہت پیارا بچہ ہے۔ اس کا انگ انگ محبت میں ڈوبا ہوا ہے۔ اپنی ماں کی بہت سی خصوصیات اس میں ہیں۔ میری بہن اب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن وہ میرے دل میں ہیں اور سدا رہیں گی میں ان کی محبتوں اور احسانوں کا بدلہ تو نہیں چکا سکتا لیکن انہیں ہمیشہ یاد کرتا رہوں گا اور دعا کرتا ہوں گا کہ خداوند تعالیٰ میری بہن کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور جنت الفردوس عطا کرے۔ آمین

پروفیسر بیگم ممتاز مشہدی
(بیگم پروفیسر محمود علی رضوی)
حیدرآباد۔ سندھ

پیاری بھابھی

جو ہر انسان عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے فنا ہوتا نہیں

بھابی پیاری بھابی ،ڈھونڈتی رہتی ہیں نظریں تمہیں، کس جگہ جاؤں؟ کہاں تم کھو گئیں؟ تمہاری یادیں، تمہاری باتیں کیسے میں بھلاؤں، بھولنا چاہوں تب نہ بھی بھلا پاؤں۔ سچ ہے اچھے انسان کبھی نہیں مرتے ،وہ تو امر ہو جاتے ہیں۔ ویسے بھی آپ نے شہادت کا درجہ پایا ہے۔ آپ نے تو اتنی تکلیف اٹھائی کہ آپ اپنے آپ کو بھول چکی تھیں۔ بھابی آپ زندہ ہیں، ہر خوبصورت پھول میں، ہر کلی میں، ہر خوش بو میں، اس گھر میں ..... مگر آپ کیا گئیں گھر کی رونق چلی گئی۔ ماشاءاللہ اتنے سارے لوگوں میں یہ گھر کتنا سونا سونا لگتا ہے۔ میں نے جب بھی آپ کے گھر جانے کا سوچا، سوچتی ہی رہی۔ بڑی مشکل سے جا پائی اور پھر گھر میں داخل ہوتے ہی آپ کا مسکراتا چہرہ میرے ذہن پر نقش ہو گیا۔ میں کھوئی کھوئی ادھر اُدھر دیکھنے لگی۔ سوچوں میں ایسی گم ہوئی کہ چالیس سال پہلے آپ کے گھر پہنچ گئی... لطیف آباد

میں آم کے پیڑ پر کوئل کی کوک اور چاندنی راتوں میں موتیا، موگرہ اور گلاب کی خوشبو، کیاریوں کے گرد چھائی ہوئی بیلیں، ننھے ننھے ہنستے مسکراتے بچے، کوئی گھٹنوں گھٹنوں چلتا، آپ کی ساڑی پکڑ کر کھڑا ہو گیا، کسی نے ساڑی کا پلو منہ میں دبا لیا۔ کوئی نیند میں آپ کو پکارتا آ گیا اور

کوئی کمرے میں بیٹھا پڑھنے میں مصروف ہے۔

کھانا پک رہا ہے، مہمان داری بھی ہو رہی ہے، بچوں کا یونیفارم دھل رہا ہے۔ وہ مہکتا چہکتا آنگن میں کبھی بھول نہیں سکتی۔ بھابی پیاری بھابی، آپ نے اتنی مختصر زندگی میں یہ سب کچھ کیسے کرلیا۔ یہ ماں کی تربیت تو ہی تھی جو آج کوئی ڈاکٹر، کوئی پروفیسر، کوئی کمپیوٹر ایکسپرٹ ہے تو کوئی صحافت کے میدان میں آ گیا اور کوئی کمانڈر بن گیا۔ سب نے اپنے اپنے فیلڈ میں خوب نام پیدا کیا۔

مجھے تو ہر بچے میں ماں باپ کا ہی عکس نظر آیا۔ نہایت، مہذب، فرض شناس، خوش گفتار، بامروت

بھابی مجھے یاد آ رہا ہے آخری دنوں میں جب میں کراچی آپ سے ملنے آئی تھی تو آپ کو بخار تھا۔ مجھے دیکھ کر میرے پاس آ گئیں ہاتھ ملایا تو آپ تپ رہی تھیں۔ میں نے پوچھا آپ کو تو بہت تیز بخار ہے کہنے لگیں ہاں ذرا طبیعت خراب ہے۔

پھر حمایت بھائی کے ملنے والے آ گئے۔ انٹرویو بھی لینا تھا تو کیسی مستعد ہو گئیں تھیں۔ کہتے ہیں وہ بیوی جنتی ہے جسے شوہر دیکھ کر خوش ہو جائے۔ آپ نے تو شوہر پرستی کی انتہا کر دی۔ تازہ کھانا پکا کر دینا، ساتھ بیٹھ کر کھانا، جب تک وہ نہیں کھائیں آپ انتظار کرتی رہیں۔ بڑے سے بڑے کام سے لے کر چھوٹے سے چھوٹا کام بڑی خوبصورتی سے سرانجام دیا۔ بھابی آپ نے تو ایسی مثال قائم کر دی کہ جو بھی آپ کی تقلید کرے گا، دنیا اور آخرت میں سرخ رو ہو گا۔ کبھی کسی کی دل آزاری نہیں کی۔ سب کے دکھ سکھ کی ساتھی بنی رہیں۔ عاجزی اور انکساری مگر پروقار طریقے سے دل آویز شخصیت، مسحور کن آنکھیں سرو قد، صاف ستھرا لباس، من موہنی شخصیت، جو ایک بار مل لے بار بار ملنے کو دل چاہے۔ غصہ کسے نہیں آتا مگر آپ کو غصہ کنٹرول کرنا آتا تھا۔ بچوں اور شوہر کی وفادار، دوستی کی علمبردار، گھر کا شیرازہ کبھی نہ بکھرنے دیا، سب کو ساتھ لے

کر چلیں، باہمی مشورے سے کام کیا، شادی بیاہ میں اعتدال رکھا، ہمیشہ حقوق و فرائض میں توازن رکھا۔ غیبت، حسد اور جھوٹ سے پرہیز کیا، بچوں کی شفیق ماں، شوہر کی خدمت گزار، بھائی بہن کے دل کی ٹھنڈک اور دوستوں کی دوست۔ اللہ کرے میری بیٹیاں (آپ کی بہوئیں) آپ کے نقش قدم پر چلیں۔

بھابی پیاری بھابی!

موت بھی نازاں ہے اس کردار پر

کل نفس ذائقۃ الموت۔ مگر ایسی موت جو رمضان کے بابرکت مہینے میں ہو جس نے جمعہ کا دن پایا۔ اللہ جوار رحمت میں جگہ دے اور جنت الفردوس عطا کرے، آمین ثمہ آمین

زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
(اقبال)

شاہینہ حسن
(کراچی)

جانی آپا

میرے دل میں یہ بات ہمیشہ کے لئے نقش ہوگئی۔ مجھے یاد ہے ایک دفعہ میرے والد محترم قاضی حفیظ الدین صاحب کراچی آئے تھے انہوں نے جانی آپا کو کافی عرصہ بعد دیکھا تھا۔ اس لئے ان کے نقوش یاد نہ رہے، البتہ اُن کی آواز میرے والد کے دل میں اتر گئی تھی۔ ہماری والدہ کو جا کر انہوں بتایا کہ ایک بچی بڑے ہی پیارے انداز میں بچامیاں کہہ کر مخاطب ہو رہی تھی، امی جان نے بے ساختہ کہا" ارے وہ غفور بھائی کی بیٹی ہوگی۔ آج آپ جانی بیگم کو بھول گئے کل شاہینہ کو بھی بھول جائیں گے"۔ جس دن میری والدہ نے یہ الفاظ کہے میں سمجھی کہ وہ میری حقیقی بہن ہیں اور واقعی انہوں نے مجھے بہنوں جیسا پیار دیا۔ وہ میرے پاس گھنٹوں بیٹھتیں اور ہم لوگ خوب باتیں کرتے۔ والد کے انتقال کے بعد وہ میرے اور قریب آگئیں اور میرا جتنا خیال رکھا میں اُسے ہمیشہ یاد رکھوں گی۔ میں انہیں کبھی بھی بھلا نہ سکوں گی۔

وہ پیاری جانی آپا تھیں
وہ میری جانی آپا تھیں

آذر نوید (جاوید)
(کراچی)

میری چچی جان

آج میں نے جس شخصیت کے بارے میں لکھنے کے لئے قلم اٹھایا ہے وہ آج ہم میں نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حضور انتہائی عاجزی سے دعا گو ہوں کہ وہ انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے اور اُن کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آمین

اس دعا کے بعد میرے پاس وہ الفاظ نہیں جو میرے جذبات و احساسات کی ترجمانی کر سکیں۔ چچا جان میرے والد قاضی شفیع الدین کے ماموں زاد بھائی ہیں لیکن وہ سگے بھائیوں کی طرح رہتے تھے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا، اپنے والدین کو اسی گھر میں آتے جاتے دیکھا۔ چھٹیوں میں کئی کئی روز دونوں گھر کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے۔ میری والدہ ہمیں بتاتی تھیں کہ بیٹا ہماری شادی کر کے تمہاری چچی ہی مجھے لے کر اپنے گھر گئی تھیں اس لئے وہ میری دیورانی بھی تھیں اور ساس بھی۔ لہٰذا اسی ناتے سے ہمارے گھروں میں گہرا لگاؤ چچا چچی اور ان کے تمام لوگوں سے ہے۔ میں نے جب بھی چچی جان کو دیکھا وہ ہمیشہ مسکراتی ہوئی نظر آئیں۔ ہم بچوں سے ملتیں تو بالکل ہم جیسی ہو کر ملتیں۔ امی ابو کے ساتھ ہوتیں تو اُن سے اُسی انداز میں ملتیں۔ خدا جانے کیا بات مجھ میں ہے کہ چچا جان کے پورے گھر کے لوگ مجھ سے بہت محبت کرتے ہیں۔ چاہے چچا جان ہوں، چچی جان یا میرے بہن بھائی، سب ہی مجھے دیکھ کر کھل اٹھتے ہیں اور میرا جو حال ہے وہ شاید میں الفاظ میں بیان نہ کر سکوں۔ چچی جان جیسی شخصیت تو شاید ہی چند ایک ہوں۔ جس طرح انہوں نے اپنے گھر اپنے بچوں اور اپنے خاندان کے لوگوں کا پیار سمیٹا

ہے، ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ میں آج بھی اپنے گھر والوں کو ان کی مثال دیتا ہوں۔ میری نظر میں وہ ایک ''کامیاب زندگی'' کی علامت تھیں۔ میری زندگی میں دو غموں کے پہاڑ ٹوٹے ہیں۔ ایک جب میرے والد کا انتقال ہوا۔ اُس وقت میں نے محسوس کیا کہ غم کی شدت کیا ہوتی ہے۔ وہ میرے بچپن کا زمانہ تھا۔ میں صرف پندرہ سولہ برس کا تھا اور پھر اب چچی جان کا سانحہ ..... رمضان کے دن تھے، میں اپنی بیوی بچوں کے ساتھ سحری کھا رہا تھا، یکا یک فون کی گھنٹی بجی فون پر امی جان تھیں، میں نے خیریت دریافت کی تو انہوں نے روتے ہوئے کہا کہ بیٹا بری خبر ہے، بھابھی ہمیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ آپ یقین کریں میری چیخ نکل گئی۔ میری بیوی نے پوچھا کیا ہوا۔ میں نے روتے ہوئے کہا ''سنبل میری چچی چلی گئیں'' میں نے فوراً روشن بھائی کو فون کیا روشن بھائی بھی رو رہے تھے میں نے شہزاد پھوپھی کو فون کیا۔ وہ بھی پھوٹ پھوٹ رونے لگیں۔ آج ۲۶ برس بعد، مجھے پھر اُسی غم سے دوچار ہونا پڑا جو والد کے انتقال پر مجھے نصیب ہوا تھا فرق صرف یہ تھا کہ اُس وقت میں اپنے بھائی بہنوں کے ساتھ رو رہا تھا۔ اب اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رو رہا ہوں۔

آسمان اُن کی لحد پہ شبنم افشانی کرے۔ آمین

بلقیس جہاں (شہزاد)
(کراچی)

امّی

آج جس شخصیت کے بارے میں میں لکھنے جا رہی ہوں وہ پرخلوص ہستی اب ہمارے درمیان میں نہیں ہیں مگر اُن کی یادیں ابھی تک تازہ ہیں ایسا لگتا ہے کہ یہ کل کی بات ہے اُن کے نواسے اور نواسیاں سب انہیں امّی کہہ کر پکارتے تھے لہذا میں بھی اُن کو امّی کہنا چاہوں گی۔

اُن کی شخصیت لاجواب تھی وہ بے حد پرخلوص اور مہربان خاتون تھیں۔ اپنے تو اپنے غیروں کے لئے بھی سراپا محبت تھیں۔ ان سے ہر شخص اپنے دل کی بات کہہ کر دل کا سکون حاصل کر سکتا تھا۔ ان کی ازدواجی زندگی دوسروں کے لئے نمونہ تھی ہمارے خاندان کی بے مثال خاتون تھیں ہر ایک کے لئے نرم دل رکھتیں تھیں۔ ان کی جدائی بھولے نہیں بھولتی۔ ان کے جانے سے ایک کمی پیدا ہوگئی ہے جیسے تسبیح ٹوٹنے پر موتی بکھر جاتے ہیں۔ موتی تو شاید پھر سے یکجا ہو جائیں مگر یہ موتی ہمیں اب نہیں مل سکتا۔ ان کا نعم البدل کوئی نہیں۔ میرے لئے ان کا ''گہوارہ'' ایک مثال ہے اور میں یہ چاہوں گی کہ میرا گھر بھی اسی ''گہوارے'' کی مانند ہو۔ اُن کی شخصیت کے بارے میں لکھنا چراغ کو روشنی دکھانے کے مترادف ہے۔ شاید میرے قلم کی سیاہی ختم ہو جائے مگر ان کی خوبیاں ختم نہ ہوں۔ ہر عورت کو اُن جیسا ہونا چاہئے۔ ایک مکمل عورت، شفیق ماں، ذمہ دار بیوی، محبت کرنے والی ساس، ناز اٹھانے والی نانی، دادی، دوسروں کے جذبات کو سمجھنے والی خاتون جواب ہم میں نہیں۔ میرے والد شیخ علی صاحب اور امی طاہرہ بیگم بھی انہیں یاد کر کے روتے ہیں۔ اللہ اُن کی مغفرت کرے اور ہمیں صبر دے۔ آمین

پروفیسر رعنا اقبال
(کراچی)

او..... دور کے مسافر

جیسے ہی میں نے فون ڈائل کیا دوسری طرف سے ایک آواز آئی ''ہیلو ... کون... اچھا اچھا..... وعلیکم السلام کیسی ہو..... اچھا بلاتی ہوں..... شاعر صاحب'' اور اگلے لمحے حمایت صاحب فون پر موجود تھے لیکن میرے کان اس شیریں آواز کے سحر سے اب تک آزاد نہ ہو سکے۔ طیبہ بھابھی (بیگم جمیل الدین عالی) انہیں کوئل کہتی ہیں تو ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ آپ بھی ٹھیک سمجھے، میں بیگم معراج نسیم کی بات کر رہی ہوں۔

ان سے میرا پہلا تعارف فون پر ہی ہوا تھا، پھر میں اکثر فون کرنے لگی وہ مجھ سے خیریت دریافت کرتیں۔ ایک دو باتیں اِدھر اُدھر کی کرتیں اور پھر خود ہی کہتیں ''ایک منٹ ہولڈ کرو میں شاعر صاحب کو بلاتی ہوں'' لیکن جب میں اُن کے گھر جاتی تو وہ مجھ سے خوب باتیں کرتیں بہت تواضع کرتیں اور یہ بات اتنی بڑھی کہ ایک روز انہوں نے مجھ سے کہا ''تم مجھے امی کہا کرو'' اور اس دن سے میں نے ہمیشہ انہیں ''امی'' ہی کہا۔ میرا اور امی کا رشتہ ایک طویل عرصے پر محیط ہے۔ اس عرصے میں میں نے ہمیشہ انہیں مسکراتے ہوئے اور دھیمے لہجے میں بات کرتے ہوئے دیکھا۔ خوبصورت ساڑھی میں ملبوس جب وہ کسی شاہزادی کی طرح دھیرے دھیرے اور بڑے باوقار انداز میں چلتی ہوئی مجھ تک آتیں تو میں انہیں بہت غور سے دیکھا کرتی تھی۔ گھریلو مسائل سے وہ ہمیشہ بہت استقامت کے ساتھ نبرد آزما ہوتیں لیکن ان کے لہجے اور مسکراہٹ میں کوئی فرق نہ آتا۔ وقت گزرتا رہا۔ یہاں تک کہ بلند اقبال کی شادی کے بعد وہ علیل رہنے لگیں۔ بیماری زور پکڑتی گئی

اور وہ بستر پر آ گئیں۔ ان کے پیروں پر ورم رہنے لگا تھا۔ میں انہیں اکثر دیکھنے جاتی اور وہ اپنے ورم زدہ پیروں سے چلتی ہوئی میرے پاس آ جاتیں۔ باتیں کرتیں خاطر تواضع کے لیے بے چین رہتیں لیکن اس حالت میں بھی میں نے ان کو بہت خوبصورت ساڑھیوں میں سلیقے سے بال بنائے ہوئے ہی دیکھا۔ ان کے چہرے سے کمزوری اور تکلیف تو ظاہر ہوتی تھی لیکن پریشانی نہیں۔

پھر ایک دن وہ آیا کہ بلند اقبال کو کراچی آنا پڑا اور امی آغا خان ہاسپٹل میں داخل کر دی گئیں۔ سب گھر والے بہت پریشان تھے لیکن اپنے اپنے طور پر ایک دوسرے کو حوصلہ دیتے نظر آتے۔ سب سے زیادہ خراب حالت بلند اقبال کی تھی۔ وہ خود چونکہ ڈاکٹر ہے ''حقیقت'' سے واقف تھا۔ مجھ سے اُس کی سرخ آنکھیں نہیں دیکھی جاتی تھیں۔ ماں سے بے انتہا محبت کرنے والا بیٹا اپنی تمام کوششوں اور بھاگ دوڑ کے باوجود حوصلہ کھوتا نظر آ رہا تھا۔ ایک شام میں آغا خان گئی امی کو دیکھنے کے لیے، بہت کمزور نظر آ رہی تھیں وہ، تکلیف ان کے چہرے سے ظاہر تھی۔ بہت دیر تک مجھ سے آہستہ آہستہ باتیں کرتی رہیں پھر کہنے لگیں۔ ''رعنا بیٹا! میں کینیڈا جا رہی ہوں، صرف چھ ماہ کی تو بات ہے ٹھیک ہو کر واپس آ جاؤں گی لیکن اس دوران تمہیں دو کام کرنے ہیں تسنیم (اوج کمال کی بیگم) کو میٹھی ٹکیاں بنانا سکھا دینا اور شہزاد اور نیلوفر کے رشتوں کے بارے میں ضرور کوشش کرنا (شہزاد ان کے بڑے داماد انور کی بھانجی اور نیلوفر اُن کی سب سے چھوٹی بیٹی زرافشاں کی نند) میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ خود اس قدر تکلیف میں بستر پر لیٹی ہیں اور دوسرں کی فکر میں مبتلا ہیں''۔ جی امی آپ فکر نہ کریں۔ آپ جلد صحت یاب ہو کر آ جایئے۔ پھر آپ ہی کے سامنے دونوں کی شادی ہوگی'' میں نے اُن کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔ بلند اقبال نے تمام انتظامات کیے اور ایک رات امی کو لے کر چلے گئے۔ میں نے اُس روز اُن کو پہلی بار شلوار سوٹ میں ملبوس دیکھا۔ گلے میں موتیوں کی مالا، ہاتھوں میں چوڑیاں، ایک عجیب نکھار تھا ان کے چہرے پر، وہ صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں اور آنے جانے والوں سے مل رہی تھیں۔ سر پر ہاتھ

رکھتیں، پیار کرتیں اور دعائیں دیتیں۔ میں انہیں بالکل خاموشی سے دیکھ رہی تھی۔ میرے ہونٹوں پر ان کے لئے بے شمار دعائیں تھیں۔ ہم سب اندر سے سہمے ہوئے سے تھے اور ایک دوسرے سے اپنے آنسو چھپا رہے تھے۔ وہ کراچی میں امی کی آخری شام تھی۔ پھر امی کی خیریت کسی ایک کو معلوم ہوتی تو تمام دوسرے بہن بھائیوں تک پہنچائی جاتی۔ کراچی اور کینیڈا ایک ہو کر رہ گئے تھے ہر وقت کمپیوٹر آن رکھا جاتا۔ امی کی خیریت جو مطلوب تھی۔

پھر ایمرجنسی صورتحال میں حمایت صاحب کو کینیڈا جانا پڑا۔ جس دن وہ جا رہے تھے، میں بھی ان کو رخصت کرنے گئی تھی۔ روشن بھائی، جاوداں باجی، تسنیم، مونا بھابی (بیگم شفیق الزماں) سب انہیں رخصت کرنے جا رہے تھے۔ اپنے اپنے طور پر خود کو مضبوط ظاہر کرنے کی کوشش ناکام ہوئی جا رہی تھیں۔ آنسو پلکوں پر اٹکے ہوئے تھے۔ حمایت صاحب چلے گئے۔ رمضان شریف کا مہینہ شروع ہو گیا تھا۔ میں کالج میں اُوج کمال سے امی کی خیریت پوچھتی۔ روشن بھائی کو گھر فون کرتی۔ ایک بے چینی سی تھی ہر طرف، بھائی جان فون کرتے۔ ڈیڈی کا فون آیا۔ امی کی طبیعت کیسی ہے؟ ہم سب ایک دوسرے کو حوصلہ دیتے۔ دعا کرنے کی تلقین کرتے۔ عجیب سے افسردہ شب و روز ہو گئے تھے۔

21/ نومبر 2003ء کو جبکہ ساتویں روزے کی سحری کا وقت ختم ہو رہا تھا کہ فون کی گھنٹی بجی۔ دھڑکتے دل کے ساتھ میں نے ٹیلیفون اٹھایا... ہیلو... رعنا... یہ اُوج کمال کی آواز تھی اور اس کے بعد خاموشی چھا گئی اوہ خدا..... میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں اس کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے کہا ''اُوج فون بند کرو'' فون بند ہو گیا۔ میرے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ یہ مشکل وقت مجھ پر اتنی جلد دوبارہ آ گیا تھا کہ میں فون پر احباب کو ''امی'' کے رخصت ہونے کی اطلاع دے رہی تھی۔ ابھی میں حمایت صاحب کے گھر روانہ ہو ہی رہی تھی کہ پھر فون بجا دوسری طرف حمایت صاحب تھے۔ میں برداشت نہ کر سکی اور وہ بھی حوصلہ کھو چکے تھے۔ ہم دونوں

رو رہے تھے۔ کسی کے پاس اتنا حوصلہ نہ تھا کہ زبان سے کوئی لفظ ادا کرتا۔

میں ،حمایت صاحب اور امی کی محبتوں سے پوری طرح واقف ہوں ۔حمایت صاحب کا ''عشق'' پھر شادی اور پھر اُن کے مسائل سے بھر پور لیکن محبتوں سے لبریز زندگی کا بھی مجھے علم ہے۔ مجھے ''14 فروری'' بھی یاد ہے جو'' ویلنٹائن ڈے'' ہے جس دن اُن کی شادی ہوئی تھی اور 1999ء کی وہ رات ،جب اُن کی شادی کی ''گولڈن جوبلی'' منائی گئی تھی ۔ روشن بھائی بڑا سا کیک لے کر گھر پہنچے تھے یعنی تھموں کے درمیان اُن دونوں سے کیک کٹوایا گیا اور ایک دوسرے کو کھلوایا گیا تھا۔ یہ سب چیزیں میرے سامنے ایک فلم کی طرح سے گزر رہی تھیں۔

21/ نومبر کو امی ہم سب سے رخصت ہو گئیں '' پکرنگ'' میں اُن کی تدفین ہوئی ، یہاں دن بھر اُن کے گھر لوگوں کا تانتا بندھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد کینیڈا سے فون پر رابطہ ہوتا۔ سب لوگ باری باری بات کرتے ،آنسو بہاتے ،ایک دوسرے کو حوصلہ دیتے وہ وقت ہم سب پر بہت بھاری تھا۔ بہت ہی زیادہ بھاری لیکن وقت کب رکا ہے۔ سو یہ بھی گزر گیا ،گھر میں اداسیوں کا پہرا تھا۔ لوگ آتے رہتے تھے۔ امی کے خلوص کی ،محبتوں کی ،ان کے رکھ رکھاؤ کی ،ان کی زندگی بھر کی محنتوں کی باتیں کرتے تھے۔ جی..... امی کی زندگی بھر کی محنتیں..... ان کے آٹھ بچوں کی شکل میں موجود ہیں۔ تعلیم یافتہ ،سلیقہ شعار ، باشعور سبھی اپنے اپنے طور پر باعزت زندگی گزار رہے ہیں لیکن امی کے بغیر وہ سب بہت اداس ہیں۔ اداس تو میں بھی ہوں۔ میں اکثر سوچتی ہوں۔ میرا اس گھر سے کتنا عجیب رشتہ ہے۔ وہ حمایت صاحب ، یہ امی ، یہ اوج کمال وہ بھائی جان ،مونا بھابی ، جاوداں باجی جبکہ فراز ، عینی ، ساحر ، کرن مجھے رعنا آنٹی کہتے ہیں لیکن یہ سب کیسے ممکن ہوا۔ صرف امی کی محبتوں سے۔ ان کے رکھ رکھاؤ سے۔ میں ان کے گھر کی ایک فرد ہوں۔ کوئی خوشی ہو، کوئی غم ہو مجھ پر بالکل اسی طرح اثر انداز ہوتا ہے جیسے ان سب پر ،امی کی محبت میں کتنی طاقت تھی جو ہم لوگوں کو اب تک جوڑے ہوئے ہے۔

مجھے سب سے زیادہ خیال بلند اقبال کا آتا ہے، کتنا بدل گیا ہے وہ بچہ! اُس کی ہر دم مسکراتی اور چمکنے والی آنکھوں میں اُداسیوں کا ڈیرہ ہے۔ اُس کا قلم صرف امی امی لکھتا ہے۔ میرا اُس سے ای میل کے ذریعے رابطہ رہتا ہے اور اُس کی آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تحریریں مجھے ملتی رہتی ہیں امی کے جانے کے بعد جب پہلی مرتبہ 14 فروری آئی تو میں خود کو نہ روک سکی۔ اس سے قبل میں صبح صبح فون کر کے سب سے پہلے امی اور حمایت صاحب کو مبارکباد دیتی تھی۔ اس بار کیا کروں؟ میں نے بلند اقبال کو میل کی، بہت سنبھال کر، خود کو روک کر میں نے اسے لکھا۔ جواب بھی ملا اور میں نے اس کی وہ تحریر بھی Save کر لی۔ پھر ایک دن اُس نے مجھے ''یا بی بی سیدہ'' میل کی۔ اُس کی اس تحریر نے مجھے رُلا رُلا دیا۔ میں نے اُسے لکھا ''بلو! یہ دعا تو میں بھی کرتی ہوں'' لیکن امی.....؟؟

O

دیدۂ نم، دلِ آشفتہ بجنوں کی توہین
شکوۂ غم، تپشِ جذبِ دروں کی توہین
دامنِ چاک، شعورِ غمِ دل کی تحقیر
پاسِ اِدراک، تقاضائے جنوں کی توہین
دل کو آزادِ رسومات کروں یا نہ کروں

کیسی گمبھیر اُداسی ہے فضا پہ طاری
کتنی سنسان نظر آتی ہے دنیا ساری
ذہن ساکت، نظر آوارہ، سخن بے مفہوم
کس کو معلوم یہ لمحات ہیں کتنے بھاری
نذر کچھ اشکوں کی سوغات کروں یا نہ کروں

اب کہ یہ دہر، بجز حدِ نظر کچھ بھی نہیں
اب کہ یہ زیست، بجز دردِ جگر، کچھ بھی نہیں
اب کہ ہر صبح ہے اک شعلۂ بے دُود کا نام
اب کہ ہر شام بجز دیدۂ تر، کچھ بھی نہیں
اب بھی میں دل کی مدارات کروں یا نہ کروں

حمایت علی شاعر

هم رشتگاں

ڈاکٹر عینی شگفتہ
(بیگم ڈاکٹر محمد محی الدین)
نیویارک۔امریکہ

زندگی کیسی ہے پہیلی.....

''پیاری امی'' کس قدر خوبصورت ہے یہ لفظ، کس قدر پیار ہے محبت ہے اس میں اور اُس سے کہیں زیادہ خوبصورت اور پیار کرنے والی تھی وہ ہستی، جسے ہم اپنی پیاری امی کہتے تھے جواب ہمارے درمیاں نہیں۔

آپ کی کون کون سی باتیں، کون کون سی خوبیاں اور واقعات تحریر کروں۔ ایک سمندر ہے جسے کوزے میں بند کرنا ہے۔

بچپن سے لے کر اب تک آپ کا وجود ہمارے لئے اس درخت کی طرح رہا جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں کبھی احساس ہی نہیں ہوا کہ سورج کی تپتی شعائیں کیسے جھلساتی ہیں لیکن آج جب آپ نہیں ہیں تو اس نعمت سے محرومی کا شدید احساس ہمیں جلا رہا ہے۔

پچھلے سال 16 اکتوبر کا دن تھا۔ وہ دن جس دن میں آپ سے ملنے گھر آئی تو میرے بھائی فراز نے چپکے سے مجھے بلایا اور میرے ہاتھوں میں آپ کی الٹرا ساؤنڈ اور بلڈ رپورٹس دیں۔ وہ لمحہ ایسا تھا جیسے بجلی گری ہو۔ اُس میں آپ کی بیماری کی تشخیص کی گئی تھی۔ ایک بے یقینی کی کیفیت تھی اس کے فوراً بعد ہی میں اور فراز سی ٹی اسکین (CT Scan) لینے آغا خان ہسپتال چلے گئے۔

مجھے وہ کیفیات یاد ہیں۔ ہم سارے راستے مسلسل دعائیں کر رہے تھے کہ اللہ کرے یہ رپورٹس غلط ثابت ہو جائیں، سی ٹی اسکین (CT Scan) نارمل ہو، کسی طرح خدا کرے کوئی معجزہ

ہو جائے کوئی دعا کام آ جائے۔ بس ہر چیز ٹھیک ہو جائے لیکن خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ سی ٹی اسکین بھی باقی رپورٹس کی طرح بیماری کی طرف اشارہ کر رہی تھیں۔

مجھے یاد ہے وہ پل، وہ لمحہ، ایسا محسوس ہوا جیسے پیروں تلے زمین سرک گئی ہے۔ ایک خاموشی طاری تھی، ہر طرف اندھیرا لگ رہا تھا سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے، دماغ بالکل سُن تھا۔ کس طرح رپورٹس لے کر گھر کی طرف روانہ ہوئے۔ مجھے کچھ یاد نہیں، بس ایک احساس تھا کہ گھر میں سب ہمارے منتظر ہوں گے، سب کو رپورٹس کا انتظار تھا کس کو کیا خبر تھی کہ کتنا بڑا طوفان آیا ہے

ہم جیسے تیسے گھر کے دروازے پر پہنچے، ہمارے سامنے ایک بہت بڑا امتحان تھا کہ ہمیں سب گھر والوں کا سامنا کرنا ہے، اپنے جذبات پر قابو رکھنا ہے اور خاموش رہنا ہے۔ اس دن پہلی دفعہ مجھے اپنے ڈاکٹر ہونے پر فخر ہونے کے بجائے غصہ آ رہا تھا ایک بے بسی کا احساس تھا کہ کچھ میرے ہاتھ میں نہیں۔ اُسی رات بلند ماما کینیڈا سے واپس آ گئے اُن کی آمد سے جہاں امی اور تمام گھر والوں کو بے پناہ خوشی تھی وہاں ہم دونوں کو سکون کا احساس ہوا، جیسے صحرا میں پیاسے کو پانی کی امید ہو جائے کہ یقیناً اب کچھ نہ کچھ علاج کا طریقہ نکل آئے گا اور امی اچھی ہو جائیں گی۔ اس کے دوسرے دن ہی آپ کو آغا خان ہسپتال میں داخل کروایا گیا۔ جہاں ایک ہفتہ آپ کے ساتھ گزرا، کہنے کو تو یہ چند دن تھے لیکن یہ میری زندگی کے سب سے اہم اور یادگار دن بن گئے کیونکہ ہسپتال سے واپسی کے ایک دن بعد ہی آپ کینیڈا چلی گئیں۔ کبھی نہ واپس آنے کے لئے۔ لیکن آپ کی باتیں، آپ کی آواز آج بھی کانوں میں سنائی دیتی ہے لیکن ان چند دنوں میں آپ سے کیا کچھ نہیں سیکھا۔ پیار، محبت، خلوص، تعلیم ہر چیز کا سبق

آپ کی شخصیت میں جو بے پناہ خلوص اور پیار تھا اس نے ہسپتال کے تمام اسٹاف کو آپ کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ نرس کو بلانے کے لئے بیل بجانے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔ وہ خود تھوڑی تھوڑی دیر میں حال پوچھنے آ جاتی تھیں۔ اتنی طبیعت خراب ہونے کے باوجود آپ کو ہر شخص

کی فکر رہتی، سب کی خیریت پوچھتی تھیں۔ ہسپتال میں نانا ابو کا فون ہر تھوڑی دیر بعد آتا تھا تو میں اور فراز امی سے مذاق کرتے تھے کہ نانا ابو کا دل آپ کے بغیر نہیں لگ رہا ہے تو وہ مسکرا دیتی تھیں۔

ڈاکٹر کے راؤنڈ پر آنے سے پہلے ہی لپ اسٹک، کاجل لگا کر بال بندھوا کر فریش ہو جاتی تھیں۔ میں اکثر کہتی تھی کہ امی ڈاکٹر کو کیسے پتہ چلے گا کہ آپ کی طبیعت خراب ہے وہ جب آپ کو اتنا فریش دیکھے گا۔ آپ اتنی اچھی لگ رہی ہیں تو امی مسکرا دیتی اور کہتیں کہ انسان کو ہر حال میں اپنا خیال رکھنا چاہیے، اپنے آپ کو اچھا رکھنا چاہیے بیمار ہے تو کیا ہوا، بیماری طاری نہیں کرنا چاہیے۔ یہ سن کر میرا دل کانپ جاتا تھا کہ بظاہر امی کتنی فریش لگ رہی ہیں اور بحیثیت ڈاکٹر میں جانتی ہوں کہ یہ زندگی اور کتنے دن کی ہے اور سوچتی ہوں، زندگی کیسی ہے پہیلی.....

''امی'' آپ کی ہر بات یاد آتی ہے۔ وہ زور دے کر ہمیں اپنے ساتھ کھانا کھلانا، دوستوں کی طرح رہنا، مجھ سے محمد، سلطانہ آنٹی اور فریدہ باجی (میرے شوہر، میری ساس اور میری نند) کا حال پوچھنا اور ڈاکٹر محمد کے تعلق سے مذاق کرنا۔ سب کچھ بہت یاد آتا ہے۔ سوچتی ہوں تو یادیں آنسو بن کر بہہ جاتی ہیں۔

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں رلائے کیوں

امی آپ کی شخصیت میں سب کے دلوں میں گھر کرنے کی بے پناہ خوبی تھی۔ میں ہی نہیں سلطانہ آنٹی، محمد اور فریدہ باجی بھی آپ کو بے پناہ یاد کرتے ہیں۔ ٹیلی فون پر جب بھی آپ کا ذکر آتا، میں محسوس کرتی کہ آنٹی کی آواز بھرا گئی ہے۔ انہیں بھی آپ سے بچھڑنے کا بہت دکھ ہے۔ محمد اور فریدہ باجی کو بھی۔ آج آپ ہمارے درمیان نہیں ہیں، دور بہت دور ہیں آسمان میں کسی تارے کی طرح، لیکن آج بھی اس تارے کی روشنی ہمارے دلوں میں ہے۔ آپ یہیں ہیں، ہمارے آس پاس ہمارے دل میں ہماری دھڑکنوں میں اور آپ کی کہی ہوئی ہر بات، ہر نصیحت

ہمارے دلوں پر نقش ہے۔ ہم آپ کی تربیت کا حصہ ہیں۔ آپ بہت دور ہو کے بھی ہمارے پاس ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ لیکن پھر بھی ''امی'' آپ ہمیں جب بھی یاد آتی ہیں اور ہم تڑپ کر رہ جاتے ہیں۔ ہم کر بھی کیا سکتے ہیں بس رو ہی تو سکتے ہیں۔

کرن الماس
(بیگم احسان علی خاں)
وینی پیگ ۔ مینیٹوبا ۔ کینیڈا

بہت یاد آتی ہیں

امی کے انتقال نے ہمارے گھرانے کو ہلا کر رکھ دیا ۔ اُن کی بے وقت موت ہم سب کے لیے قیامت سے کم نہیں تھی ۔ سب سے بڑی یہ بات تھی کہ اُن کے بارے میں ہم سب کو اچانک پتہ چلا اور وہ بھی آخری Stage میں ۔ اُن کی طبیعت بہت خراب ہوئی اور اُن کا انتقال ہو گیا ۔ اُن دنوں میرے امتحان چل رہے تھے ۔ میں مائیکرو بیالوجی میں ایم ایس سی کر رہی تھی ۔ میرا ایک مضمون وائرس (Viruses) پر تھا ۔ وہ مضمون تو مجھ سے پڑھا ہی نہیں جا رہا تھا ۔ مجھ سے امتحان کی تیاری نہیں ہو رہی تھی اس لیے کہ مجھے وائرس (Viruses) کو پڑھتے وقت امی کا خیال آتا تھا کہ ان وائرس (Viruses) کی وجہ سے ہماری امی پر کیا گزری ہوگی اور وہ اُن کی وجہ سے کتنی تکلیف میں مبتلا ہوں گی ۔ سب سے بڑھ کر تکلیف دہ بات یہ تھی کہ آپ کو پتہ چل جائے کہ جو بیماری اُن کو لاحق ہوئی ہے، اُس کا کوئی علاج نہیں ہے اور وہ کچھ عرصے بعد آپ میں نہیں رہیں ہوں گی ۔ ہماری امی ہمارے لیے ایک دوست کی طرح تھیں ۔ ان سے ہم سب بچے بہت فری تھے ۔ اب بھی ان کا سوچتی ہوں تو ایسا لگتا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ ہیں ۔ وہ مزاج کی بھی بہت اچھی تھیں ۔ میں نے اُن سے کبھی بھی کسی کی برائی نہیں سنی ۔ انہوں نے ہمیں کبھی بھی نہیں ڈانٹا ہر وقت ایک مسکراہٹ اُن کے چہرے پر ہوتی تھی ۔ اُن کو کبھی زور سے بات کرتے نہیں سنا ۔ اُن کے انتقال کا سوچو تو یقین نہیں آتا کہ وہ جلدی چلی جائیں گی اور اتنی اچانک گئیں کہ کسی سے کچھ کہا

بھی نہیں۔ مجھے تو اب بھی اُن کی موت کا یقین نہیں ہے۔ لگتا ہے کہ وہ اس وقت پاکستان میں ہیں مجھے اپنی شادی میں بھی اُن کی کمی بہت زیادہ محسوس ہوئی اور ہر وقت اُن کا خیال آتا رہا۔ ابھی ۲۲/ اگست ۲۰۰۳ء کو ہماری بیٹی کومل خاں پیدا ہوئی تو اُس وقت بھی مجھے امی بہت یاد آئیں۔ کاش وہ زندہ ہوتیں تو اپنی ''پڑنواسی'' کو دیکھتیں اور کتنا خوش ہوتیں۔ میرے شوہر نہال (احسان علی خان) اور ان کے والدین بیگم و پروفیسر ڈاکٹر خورشید علی خاں کو بھی امی کی بے وقت موت کا بیحد صدمہ ہے گو کہ ان کا ساتھ بہت کم عرصے کے لیے رہا پھر بھی وہ ان کی پرخلوص شخصیت سے متاثر ہیں اور ان کی یاد کرتے ہیں امی کی موت نے ہماری نیچر تبدیل کر دی ہے اور پتہ نہیں ہم لوگ اپنے آپ کو کب نارمل کر سکیں گے۔ میں تو اپنے نانا ابو کو دیکھتی ہوں تو ہمت آتی ہے کہ کس طرح انہوں نے اپنے آپ کو ہم سب کے لئے سنبھالا ہے وہ اُن کے کس قدر نزدیک تھے! تو پھر ہم اپنے آپ کو کیوں نہیں سنبھال سکتے ..... لیکن امی کی جگہ کوئی بھی نہیں لے سکتا۔ ان کی محبت ہی بہت زیادہ تھی وہ ہر وقت ہمیں تڑپاتی رہے گی۔ بس اب تو یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُن کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین

مرنے والے، مر تو جاتے ہیں، فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

Dr. Syed Faraz Masood Rizvi

(Toronto - Canada)

The Most Painful Days Of My Life!

I still remember those days when it was hardly four months when I got into the final year of MBBS and just two months when I got the result of my fourth year. Cricket week was being celebrated in our College, and I used to see the whole games in which our class-team was playing, it was end-September. But whenever I came home on those times, I felt that Amanni was being very lethargic and once or twice it happened that she wasn't able to stand up from sitting.

After one or two days, when I came back from a friend's place, Nana abbu told me that my youngest mamoon Dr. Baland Iqbal had called from Canada and asked me to take amanni to a hospital, I called at different places and learned that one of our College Professors Dr. Masood Hameed Khan was available at OMI Hospital. Amanni, Nana abbu and me went to OMI, Ammu Jaan (my eldest mamoon) also reached there. Dr. Masood saw Amanni and said that she had Chronic Liver Disease, and asked me for some work-up. The next day I took Amanni to Aga Khan for Ultra-sound, and one of the radiology residents told me that

she had some spots in her liver, "What Do You Mean?", I asked, the radiologist told me that she most probably has liver cancer, I couldn't feel any earth beneath my feet, I asked her if she was sure about it and she said she was 90% sure and CT scan will confirm it. CT scan confirmed it. I was in utter shock.

I emailed Baland mama without telling anyone at home except my cousin Dr. Ainy, he went through the shock and denial phase, he was constantly sending me emails "Faraz are you sure?" and "What are you sending me?" but I was helpless, I was sending him the reports which I was getting. We all were helpless.

The next day me and Nana abbu were to go to Dr. Masood where he had to tell the reports to Nana abbu, which I already knew. The same day in the morning I went to Civil Hospital and told him the reports, I still remember his words, he said, "We have lost the battle", later Baland mama called him on phone and requested him not to tell the reports of Liver Cancer to Nana abbu. I was not in the position to handle Nana Abbu at that time, I I simply didn't have that courage.

On the 8th of October, Baland mama came to Pakistan and I still remember he wept in my room, because still at that time, me, Ainy Baji and Baland Mama knew the whole story. The very next day he took amanni to ER of Aga Khan, where after basic workup she was admitted to the Hospital. In the hospital her all workup

was repeated and she was diagnosed to have Liver Cancer. Even at the point, we didn't disclose it to anyone but told everyone that her condition was serious. In the meantime Baland mama was busy with Doctors to decide the next step and also in home with all the elders. Jawedan aunty, Moona aunty and Baland Mama used to stay with Amanni at nights. Ammu jaan, Auje Mama and Tasneem aunty spend a lot of time with Amanni inspite of their hectic job hours and especially Tasneem Aunty who had a six months baby. Ainy Baji and me used to stay during the day. Kiran, Khurram, Sahir, Adeel and Azar and other kids inspite of their exams used to come and spend time with Amanni, although they never knew she had cancer.

Then Mama, Nana Abbu and all the big-ones decided that we would take Amanni to States and Canada for treatment. On the 17th of October, Amanni, Baland Mama and me flew for Canada and after staying a day at our house in Toronto we went for Cleveland, Ohio, where my youngest Khala, Dr. Zerafshan Syed (Guriya Khala) and her husband Dr. Wasim Khan were living. We admitted her to the Metro Hospital, Cleveland and then disclosed there to everyone that Amanni had Cancer. Guriya Khala just had a baby merely 2 weeks old, still she was on her feet for Amanni, she had no other choice, she was crying and running back and forth to hospital and home to keep things running. Baland Mama's wife Shajia baji was in Cleveland too,

she was also caring for Amanni. Wasim Bhai did everything he could do to make things better and contacted with every Doctor he could.

In the hospital, we didn't tell the doctors that we knew she has cancer, her all investigations were repeated from the very start, may be that was our denial phase or we were expecting a miracle that something will happen that will change the course of the disease but now I think miracles are not meant for us, they are only meant for prophets!! The result was the same, she had Liver Cancer. They told us that she is not going to live too much, at the most 6 month, but most probably 1-2 months, that was the end of October. At that time Baland Mama was busy emailing all around the world for Liver Transplantation, there were many hurdles, some problems were in the system others were with Amanni's case. He emailed Singapore, India, Europe and within States and other countries, but everyone told us that it was impossible due to some reasons, he still didn't give up and kept trying.

At that time Nana abbu was unaware of all these things, he came to Cleveland, and I still remember Amanni was wearing a Red Saree that day, I was teasing Amanni "I know why are you wearing a Red Saree because your "Pateedev" is coming today" and she was smiling back at me, it was the very same saree she was wearing at Baland Mama's wedding earlier that September.

In Cleveland, we were hopeless, so hopeless that even one of the American Fellow wept in front of us because she saw us passing through same phase as she once passed during her father's illness. A study medication was also tried, which was only tried on 16 patients before, where it showed that it brought some improvement in some people but that trial medication didn't help either. Then we came back to Toronto on the last day of October. After that, Amanni's condition started deteriorating, her jaundice was increasing and she was getting confused, we took her to the hospital thrice in three weeks while we were in Canada and still Baland mama was in contact with different Doctors all around the world to find a way out, just to see if there was light at the other end of the dark tunnel, for just a miracle.

During this period, my mother was suffering from her bad stomach pains while in Toronto, they were so bad that she couldn't do anything, and we had to give her sleeping pills and other medications to keep her away from waking up and experience pain. They started when she heard of Amanni's Cancer news when we were in Cleveland and it took about 3 weeks to come her to normal.

That was a time when every member of our family did more than they could do, Samina Aunty, my eldest mami, who was always on her feet no matter it was Karachi or Toronto to take care of Amanni and Nana abbu, daily came to see Amanni from

her job and stayed there till past midinight, and often she stayed at our place for caring Amanni. Jamal Mama and Farheen bajee also came from job and did everything they could do. Shajia Baji, merely a newly wed bride of 2 months was in our house and was standing side-by-side with everyone to take care of Amanni. Guriya Khala came from Cleveland to Toronto and rented an apartment just to keep her kids in that apartment so they couldn't disturb Amanni, she was divided between her kids and Amanni. Beena, my sister took a leave of one week from her University, even Talal, Sana, Fairy and Fawwaz were there for Amanni.

I think it was 15th of November, Amanni got badly confused and we immediatly called 911, I saw Nana abbu crying and saying Khuda hafiz to Amanni, when they were carrying Amanni on a stretcher, she was rushed to Toronto General Hospital. I reached there a little late. Samina aunty, Jamal mama and his wife Farheen Bajee were with Amanni and I was in ER waiting room when Baland Mama suddenly came out and took me outside and started crying, said that "Drs say it is hard if she'll survive this weekend", it was friday. Amanni miraculously came back that night and she was admitted to the floor. Everyone including Nana Abbu, Ammi, Abbu and Guria Khala were in the hospital but her condition started worsening hour by hour, and I still remember when we all were standing around her, crying and asking her to wake up and she was lying their quietly.

The next day, Amanni got a little better, just enough to open her eyes and recognize, when nana abbu was there besides her and he said "Meraj" she opened her eyes and when Guriya Khala brought her daughter Zoya to her, and when we said, "Amanni, dekhein kaun aaya hai", she opened her eyes, saw Zoya and smiled, that was the last time she literally smiled.

But that was for a little time she got better, her condition got bad, for not to become good again. And after that she didn't recognize anyone, she was being fed through her veins, she was too ill to take food by mouth, she was literally in coma. Me and Baland Mama spend that week in the hospital, we saw her condition getting worse, that was the most painful days of my life. Then doctors said that we should take her either to home or any Palliative Care Facility, because nothing was left except for palliative cars, so on the 20th of November, we brought Amanni back to our home.

The next day me and Jamal mama went to downtown to get the strong pain medications - to kill the pain which was hurting Amanni. When we got home, I gave them to Baland mama and went to washroom, I was readily called that amanni's condition had suddenly got bad. When I came back to her room, everyone was crying and baland mama was checking her BP and pulse, he asked me to call 911. I ran downstairs while calling 911 and saw Nana abbu and Guria Khala coming from outside, I asked them

to go to Amanni. I also got a call from Samina aunty who was asking me how Amanni was doing, I asked her to come immediately. The crew of 911 reached in a few minutes, they tried to resuscitate amanni but in vain, the inevitable had come and she took her last breath to left us forever. I won't forget that moment for my whole life, we all were crying badly, even at that time Nana abbu showed us the degree of intellectuality he possesses by the way he reacted and controlled his emotions, at that time when the love of his life was snatched away from him, the love of more than fifty years. That was Thursday, the 21st of November 2002, the worst day of our lives.

My abbu was at job, he came back rushing. Wasim Bhai came back rushing from Cleveland in five hours too. My sister Beena came from Waterloo who had left the same morning, in a few hours whole of our house was filled with people including Mazhar Bhai and Uzma Bajee, Parvez Bhai and his wife, we all were there for Amanni and for each other. The Police Coroner also came there and asked us about the funeral arrangements.

Amanni had a smile on her face when she left. We often asked each other why she had that smile, we used our humanly thoughts to answer it. was she too happy to leave that pain which was haunting her for so long?? or there was some "big" reason behind her smile or was it a mere coincidence?? We don't know, but we knew that our "Gehwara" was broken, she had left us

orphans to face the wild and ruthless winds of the world. She had left Nana abbu.

Amanni always loved Greenery, she had a passion for plants and greenery. In our house here in Karachi, she always kept a sort of small nursery on the top floor. The fate brought Amanni to the same greenery she aiways loved. She was buried the next day in the graveyard of Pickering, a small city few miles east of Toronto, which is a lush green graveyard, it is all-green like someone has laid a green carpet there, and one could only see greenery, tombstones and flowers. There were alot of people at the time of funeral and many have come from US only to attend it. It was a dark, windy and rainy day. Everyone was crying there, Baland mama held Nana abbu's hand, Nana abbu was crying as he saw Amanni going down that grave. I could feel the pain.

Nana Abbu has been a very famous person, although Amanni travelled with Nana abbu on quite a number of occassions but it was on her death I realized that how much famous Amanni was. The news of her death spread like a wild-fire, this news was published in certain newspapers all around the globe and telecasted on TV in Pakistan. We received phone-calls from many parts of the world including United States, Canada, England, Pakistan and India. We received phone calls from Nana abbu's brothers and sisters especially Inayat Nana,

Qamar Uncle - amanni's nephew and Amanni's sister Nawab nani from India and from many other people.

According to our Islamic faith, Quran is read after the death of a person to give spirtiual peace to the deceased and the living ones. Innumerable numbers of Qurans were read all over the globe by the people who admired and loved Amanni, it was then I realized that fame and money are secondary things, the thing which really matters is the love you give to others. And surely Amanni met everyone with a warm and open embrace throughout her lifetime, and delivered her love to others, which we received back after her death and for that we're thankful to every one of them.

Although she has gone, but she is immortal in our hearts, in our every thought and imaginations, I can still feel the touch of my Amanni's hand on my head when I used to keep my head on her lap. I want everyone to feel that intensity and emotion I have, because those who were in direct contact with Amanni will remember everything of her, but I want that the coming generations of our family to feel her as deeply as we did, to feel that pain that she had to go through or we are going through.

I also wrote this with the intention that whenever we'll read it we could feel her presence among us, because its the law of nature, we only remember those who have a constant influence in our lives, but those who go away, we usually lose that

influence and forget them and I don't want myself or anyone else in our family to lose that influence.

We love you Amanni and we will never let yours and Nana abbu's "Gehwara" shatter away - that's a promise!

محمد علی الدین خرم
(کراچی)

زندگی بہت ظالم ہے

انسان چاہے کتنا بھی دور چلا جائے مگر اس کی یادیں ہمیشہ اس کی موجودگی کا احساس دلاتی ہیں۔ زندگی میں خوشیاں اور غم تو ہر کسی کے مقدر میں ہیں مگر کبھی سوچا نہیں تھا کہ زندگی اتنی ظالم ہوگی کہ جہاں اس نے ہزاروں خوشیاں اس ''گہوارہ'' کے دامن میں ڈالیں مگر اس کے بدلے ہم سے وہ شخص مانگ لیا جس کے بغیر ہم کچھ نہیں۔ وہ دن کتنے اچھے تھے جب ہم کو پتہ چلا کہ میرے ماموں کی شادی ہونے والی ہے اور میں امنی اور امی کو ساتھ لے کر صدر اور طارق روڈ شادی کی شاپنگ کرنے جاتا تھا اور وہاں کی چاٹ کھاتا کیونکہ امنی بھی کچھ کھلائے بغیر واپس نہیں جاتی تھیں ہم روز شاپنگ کے لئے جاتے تھے، آخر کار ماما کراچی آگئے اور ان کی بہت زور وشور کے ساتھ شادی ہوئی جس میں ہم سب Cousins نے Dance بھی کیا اور سب لوگوں نے Enjoy کیا مگر کس کو پتہ تھا کہ گہوارہ پر ..... جس کے ہر فرد کے چہرے پر مسکراہٹ تھی کب تاریکی چھا جائے گی۔

ماما کی شادی ہوگئی اور وہ کینیڈا چلے گئے اور دن یوں ہی گزرتے رہے اور میں اپنی پڑھائی میں مصروف ہوگیا کہ ایک دن میں University سے گھر آیا تو عینی باجی نے مجھ کو بتایا کہ امنی کی طبیعت بہت خراب ہے اور بلو ماما کل پاکستان آرہے ہیں 18th اکتوبر کو ماما پاکستان آگئے اور دوسرے دن ہی امنی کو Aga Khan Hospital لے گئے اور وہاں admit کروادیا۔ اس وقت تک مجھ کو صرف یہ پتہ تھا کہ امنی کی طبیعت خراب ہے مگر جب ماما نے امی اور

دوسرے گھر کے بڑے افراد سے امی کو کینیڈا لے جانے کے لئے کہا تو مجھ کو پتہ چلا کہ امی کو Liver Cancer ہے اور وہ بھی Last Stage پر اور وہ صرف تین، چار مہینے کی مہمان ہیں۔ اگر امی کا کینیڈا میں علاج ہو جائے تو وہ صحت یاب ہو جائیں گی۔ امی کو امریکہ اور کینیڈا لے گئے علاج کے لئے، اپنی ہر کوشش کر لی مگر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔

۲۲/ نومبر، جمعہ کے روز ہمارے ''گہوارہ'' پر قیامت کا منظر تھا۔ امی ہم سب سے بہت دور چلی گئی تھیں۔ یہ دن میری زندگی کا سب سے تکلیف دہ دن تھا۔ جیسے جیسے لوگوں کو پتہ چلا لوگ گہوارہ ہاؤس میں جمع ہونے شروع ہو گئے۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ایک عجیب منظر تھا۔ دن بھر لوگ آتے رہے۔ امی کی محبت میں لوگوں کو وقت کا پتہ نہیں چلا۔ رات کے چار بجے تک لوگ ملنے آتے ہی رہے تھے مگر جو کچھ بھی ہوا ..... دل اب بھی اس بات کو نہیں مانتا کہ امی اب ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ لگتا ہے کہ امی کینیڈا گئی ہوئی ہیں اور بس ابھی واپس آ جائیں گی اور میں پھر سے ان کے ساتھ خوب مزے کروں گا۔ امی آپ کی ہر پل یاد آتی ہے۔ آپ کو صرف ہم ہی نہیں، صدر کی وہ چاٹ اور فالودہ بھی یاد کرتے ہوں گے جو ہم ہمیشہ آپ کے ساتھ کھاتے تھے۔ ایک بے یقینی کی کیفیت ہے کہ کیا واقعی آپ ہمارے درمیان نہیں ہیں؟ یہ سوچتا ہوں تو دل تڑپ جاتا ہے، بس یہی سوچتا ہوں کہ

واقعی زندگی بہت ظالم ہے جس نے ہمیں یہ وقت دکھایا۔

Beena Masood Rizvi

(University of Waterloo, Canada)

"What Can Be Said About The Loss!"

It's been almost a week now that I'm trying to capture some of my memories regarding Amanni in words. Every time I sit in front of my computer or with a paper and pen in my hand, I keep on thinking but don't know where to start from.

Thoughts about Amanni come to mind all the time; something here or there reminds me of her, someone says something, and I would relate it to Amanni, so many times my Ammi says something and I feel dejavu'...Amanni! But when it was my turn to scatter my thoughts on paper...I was lost and did not know where to start from.

Shall I start with the very first memories I have of her? Or with the last bitter ones?? Shall I write about how she was one of the most influential people who have groomed my self being and is the source of my ultimate motivations or about how her absence has stirred my emotional life?

I am wandering...drifted away within my thoughts.

First thing that comes to my mind whenever I think about her is the smile she gave me when I went to Toronto to meet her,

as she was brought here from Pakistan with some unfulfilled hopes of cure. This was the 18th or the 19th of october'03, almost 31- 32 days before her death. She was sick and suffering, but her smile was the same motherly,comforting, affectionate one she always used to have on her face, but there was something else to it. I can never forget that look in her eyes, all I could see there was pain, ache, and agony. Moreover, to my surprise, I noticed an unusual expression; she was trying to recognize me! It took her a while to recall my name. I was shocked and disheartened. It was not until now that I started to notice several other unusaualities in her cognition that made me belief what my brother had told me about her illness only a couple of days before.

This turned out to be the last time she smiled at me...and is preserved in my mind forever!

We all were struggling hard to bring her back. She was going far, way far beyond our reach. Not only her physical health but even cognition was severly affected and we were losing her. We all wanted to take all of her pain away, we all tried as best as we could, we prayed, we did what so ever was possible and not possible to bring her back to us, to bring her smile back to us, but our endeavors seemed to fail.

I loved to go sit in her feet when she would be sitting on that particular sofa chair in our huge 'Hall' room, as we call it. She

used to ask me to let her go, cause she was tired of sitting there or had to use the washroom, but I never wanted to move. She used to say that I am like a 'saas' to her...and that too an evil one, because I loved to annoy her. Nana abbu always says that I m his 'amma' so I used that as a 'license' to act like Amanni's 'saas'. I know she loved me and always enjoyed my stupid little jokes.

I remember those days when my family was in Saudi Arabia and I and my older brother were living with Amanni nana abbo. Coming back from college in those hot scorching summers, all I wanted to do was to go and lie down beside Amanni with my head on her lap. She would ask me to go change, freshen up, eat something and then get some rest, but I always wanted to lie down beside her as soon as I was home. How could she realize how relaxing it was to be with her.

I wonder if she did.

Sometimes I ponder if Amanni is really not among us any more. It feels as if Amanni is in Pakistan at our home in Shah Faisal Colony. I find it so hard to convince my self that she really has left us for ever. Although I saw her by my very eyes that entire she was going through in the last few dreadful days of her life.

It was the morning of the 21st of November, mid of Ramadan, when I had to go to Waterloo, where my university is,

from Toronto to write my exam and come back the same night. I remember calling home from university just before I was about to leave for my exam and my brother telling me that we've lost her forever. I can't recall what happened after that or how did I react to it but I remember how I was trying to get hold of my friends most of whom had already left for the exam. I was not able to think straight at that time and needed someone around me. Luckily, I got hold of one of my really nice friends, Nimita, who tried to arrange a ride for me to the main bus station. It was freezing cold and snowing at that time and i was standing outside waiting. I was in a rush so took a cab instead and managed to reach the bus station right on time, but the bus was late!
These 3 hours, was the longest time of my life. I was trying hard to stop my tears while I was in the train and the bus. I recall now, and wonder what all those people around me would be thinking, but I had absolutely no sense of self control then. I remember this one stranger, who came up to me and asked me that why I was crying and if I was lost and need any help, while I was waiting at the main bus terminal to get a bus to Toronto. He was Persian and would be around 55-60 years of age. He somehow recognized that I was muslim too and asked me if I was fasting. I was fasting and in all this hassle had completely forgotten to break my fast, and the iftar time had passed almost one and a half hours ago! He bought me something to eat and let me use

his cellphone for I had to call home long-distace and had no cash money on me at all. He kept talking to me to make me feel better throughout the way. I remember him telling me about how his wife died a couple of years ago and what he and his children went trough that time. He made me realize how in a way it is so much better for Amanni that she doesnt have to bear her miseries anymore! He gave me his contact numbers before he had to leave and told me to contact him whenever I have a problem. I am very thankful to him for all he did without even knwing me at all, because now i undestand that in times of such troubles, how even complete stangers can be like angels.

On my way to Toronto I couldn't believe that I was actually going through all this. I know how hard was praying to god that this all somehow turns out to be a nightmare, I was trying to realize how is that even possible that Amanni has left us for ever, and then I started to believe that this all is just a dreadful nightmare and that I will come out of it soon, but I could not!

I can never imagine what my Ammi was going through when being her grand daughter I was going through a hell.

I reached home and there was my Amanni lying on the bed, sleeping deeply, exactly how I saw her in the morning before leaving for Waterloo. I had always read and heard people talking about deaths of their loved ones, I had watched on T.V and movies people mourning over similar scenarios, but never had I

understood how exactly it feels like.

She had a smile on her face; that we often wonder of why! It was the same serene, affectionate smile she always used to have on her face; placid and calm. After long had I seen her smiling like that! At last she is liberated from all her miseries!

Sahir Shafiq

(Karachi)

For My Dearest Grand Mother

Mairaj Naseem

Missing you in every minute of my life.
Missing you so badly that air of your love surrounds me
and feels me you are somewhere around me.
I feel your touch but I can't touch you.
I am feeling warmth of your breath
but my breaths don't return to me
touching your face.
Feeling your silky soft hair shadow on my
eyes but I can't comb them with my hand.
Your words whisper in my ears
but when I speak no one is the listener.
I feel that your expressive eyes are watching me
but it seems like a daydream.
I feel your care and support with me
but I can't protect you in the same way.
You are in front of me but I can't hug you.
It all seems miracle, magic of love.
Does the same magic happen to you?

Talal Roshan
(Toronto - Canada)

The most precious Jewel

(21st Nov 2002)

Can't believe you are not with us anymore
Your absence has shed billions of tears,
Please have mercy oh my Lord!

All that time, those moments, those peaceful days
Will make us weep, everytime we,ll look at our fate

I love you a lot "Amanni" that's all I can say
Remember those memories,
Think about you until my eyes are red

Still remember that smiling face when you were lying lifeless
Your soul was in heaven and our grief was endless

And now we gather around your grave
Praying to Him, who blessed us with tears and took you away

Alone in that grave, u must be cold
I realized it last time, while clearing the snow

My God you have taken the most precious jewel
We'll cry all lives, this pain won't heal

ثناءٔ مسعود رضوی
(ٹورانٹو)

ہمارے گھر کی روشنی ..... میری امّی

میری امّی کو کوئی جانے اور ان سے محبت اور ان کی عزت نہ کرے بالکل ایسی بات ہے جیسے کسی دن سورج نہ نکلے۔ ان کی شخصیت اتنی پروقار اور محبتی تھی کہ وہ جس سے ملتیں وہ ان کی عزت کرنے لگتا۔ اس بات کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب امّی ہمارے پاس سے چلی گئیں اور دنیا کے ہر کونے سے لوگوں نے نانا ابو کو فون کیا اور پُرسہ دیا۔ امّی کم بولتی تھیں لیکن جب بھی بولتیں صحیح بات بولتیں۔ فارغ وقتوں میں یا تو اخبار پڑھتیں یا پھر کوئی کتاب پڑھتی رہتیں۔ سارا دن گھر میں رہنے کے باوجود انھیں باہر کی ساری معلومات تھی۔ اُن کا مشاہدہ بھی بہت گہرا تھا۔

اب جب بھی میں امّی کے بارے میں سوچتی ہوں تو ایک بہت ہی مضبوط عورت کا خیال آتا ہے۔ ایک ایسی عورت جنہوں نے زندگی میں بہت کچھ دیکھا، پاکستان آنے کے سبب اپنے ماں باپ سے ملاقات نہیں کر پانا اور پھر اُن سے ''محروم'' ہو جانا اُس کے باوجود انہوں نے ایک مکمل زندگی گزاری اور اللہ تعالیٰ نے بھی امّی کو ایک بھرپور زندگی عطا کی۔ ہر طرح سے بھرپور اُن کی قسمت کہ خدا نے انہیں زیادہ دن تکلیف کے نہیں دیکھنے دیئے اور نہ ہی ہمیں۔ کینسر کی تکلیف کا امّی نے بہت تھوڑا عرصہ دیکھا، جو اُن کے لیے بھی بہتر تھا۔ ہم میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ امّی کو اتنی تکلیف میں دیکھ سکتے۔ یہ صحیح ہے کہ امّی ہماری زندگیوں میں سے بہت جلدی چلی گئیں، اتنی جلدی کہ میں دماغی طور پہ یہ دیکھنے کے لیے تیار بھی نہیں ہوئی تھی لیکن اگر میں امّی کو اتنی ناقابل برداشت تکلیف میں زیادہ عرصے دیکھتی تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا اُن کے علاج کے لیے ہر

طرح کی کوشش ہو چکی تھی اور ہر طرف سے جواب نفی آ رہا تھا۔ امی کو اس تکلیف سے نجات ملی اور ہمیں یہ احساس کہ امی اب تکلیف میں نہیں ہیں لیکن پھر امی کے چلے جانے کا غم اور اس بات کا احساس کہ اب ہم کبھی بھی، کبھی بھی امی سے نہیں ملیں گے ہمارے غم کو دگنا کر دیتا۔ اب صرف یہ سوچ کر کے امی پاکستان میں نہیں ہیں، پاکستان جانے کے خیال سے ہی دل بجھ جاتا ہے۔ جب نانا ابو امی کے گھر کے بارے میں سوچتی ہوں تو احساس ہوتا ہے کہ اب وہاں کچھ نہیں ہے۔ سوچتی ہوں جب جاؤں گی اور امی کو اُن کے کمرے میں نہیں پاؤں گی یا اُس صوفے پر جس پر بیٹھ کر روز اخبار پڑھا کرتی تھیں، خالی پاؤں گی تو اپنے آپ کو روک نہیں سکوں گی اور گھر میں جب ہر جگہ امی کی تصویریں دیکھوں گی تو کیسے اپنے آپ کو دلاسہ دوں گی۔ خدایا!

چاہے کچھ ہو جائے میں امی کو یاد کرنا نہیں بھول سکتی۔ انہیں یہ نہیں بتا سکتی کہ اُن کی جگہ کوئی کبھی بھی نہیں لے سکتا۔ وہ اور اُن کی یادیں میرے دل میں ہمیشہ تازہ رہیں گی۔ میں اُن سے ہمیشہ سے زیادہ پیار کرتی رہوں گی۔

اے کاش کہ امی لوٹ کے آ سکتیں۔

اے کاش میں یہ یقین کر سکتی کہ خدا سے جو مانگو مل جاتا ہے تو اپنی امی کو مانگ لیتی۔

محمد عدیل الدین
(کراچی)

ہمارا گہوارہ بکھر گیا

دن جمعہ تھا، ۲۲/ نومبر ۲۰۰۲ء، وقت صبح کے 3.25 ہو رہے تھے۔ میں اپنے اگلے دن میٹرک کے پرچے کی تیاری کر رہا تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس وقت امنی کے ساتھ Canada میں کیا ہو رہا تھا میرے علم میں تھا کہ ان کو Liver Cancer ہے مجھے عجیب سا محسوس ہونے لگا تو میں اپنے آپ کو تسلی دینے لگا اور خدا تعالیٰ سے دعائیں کرنے لگا کہ جو کچھ بھی ہو بہتر ہی ہو۔ یہ سوچ کر میں پڑھنے لگا کہ اچانک 4.00 بجے فون کی گھنٹی بجی۔ میں پریشان ہو گیا اور جلدی سے فون اٹھایا۔ ٹورانٹو سے جمال ماما کا فون تھا۔ انہوں نے مجھے امی کو نیند سے اٹھانے کے لئے کہا۔ میں نے جلدی سے امی کو اٹھایا اور امی کو فون دے دیا۔ ماما نے امی کو یہ اطلاع سنائی کہ اب امنی ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ اس وقت میرے دل میں ایک ہی بات آئی کہ ہمارا گہوارہ ٹوٹ گیا۔ امی بہت روئیں تھیں میں نے اتنے میں اپنی باجی (عینی) اپنی آپی (کرن) اور علی بھائی کو اٹھایا اور بتا دیا کہ اب امنی ہمارے ساتھ نہیں رہیں۔ کرن آپی نے جلدی سے اموجان کو فون کال کر کے بتا دیا کہ اب امنی ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ اموجان 20 منٹ کے اندر گھر آ گئے۔ ان دنوں سردیاں تھیں اور اموجان Sleeping Suit پہنے ہوئے تھے۔ مونا انٹی اور اوج ماما کو ابھی تک یہ بات معلوم نہیں تھی اور اموجان اور امی نے سوچا کہ ان دونوں کو صبح بتائیں گے کہ اتنے میں شفیق انکل کی فون کال آئی اور انہوں نے یہ بتایا کہ مونا انٹی کو پتہ چل گیا ہے کہ امی ہمارے بیچ نہیں رہیں اور مونا انٹی بہت رو رہی ہیں تو اموجان نے یہ فیصلہ کیا کہ مونا انٹی کو لے کر گہوارہ ہاؤس چلے جاتے ہیں

پھر اموجان امی کو لے کر مونا انٹی کے پاس چلے گئے۔ میرا دو گھنٹے بعد پرچہ تھا تو مجھے باجی نے تھوڑی نیند لینے کے لئے کہا۔ پہلے تو میں نہیں مانا مگر پھر میں لیٹ گیا۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی مجھے صرف امی کی یاد آ رہی تھی۔ جب میں پرچہ دینے کلاس میں بیٹھا تو میرے خیال میں سوائے امی کے، کچھ نہیں آ رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور دل جیسے بند سا ہو گیا تھا۔ وہ تین گھنٹے میری زندگی کے قیامت جیسے تھے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اور میں پرچہ دے رہا تھا۔

جتنی میں نے کوشش کی کہ وہ یادیں بھلا دوں مگر وہ آنسو بن کر میرے دل میں اترتے چلے گئے اور ہمیشہ کے لئے میری زندگی کا ایک حصہ بن گئے۔ جس دن سوئم تھا اس دن میرے ابو انوارالدین بغیر اطلاع دیئے سعودیہ سے کراچی آ گئے۔ ہم لوگ گہوارہ ہاؤس میں جمع تھے۔ میں دوسرے فلور پر تھا کہ اچانک مونا انٹی کے زور سے رونے کی آواز آئی۔ میرا دل سہم گیا جب میں نیچے گیا تو میں نے دیکھا کہ میرے ابو مونا انٹی کو تسلی دے رہے تھے۔ ابو اسی وقت گھر میں داخل ہوئے تھے۔ اس وقت ہمارے گھر میں بڑوں میں صرف میرے ابو ہی تھے اسی لئے انہوں نے اپنے غم کو چھپایا اور ہم سب کا حوصلہ بڑھایا۔ امی کے جانے کی یہ ایسی خبر تھی جس سے دل تو ٹوٹا ہی تھا ایسا لگا کہ ہمارا گہوارہ بھی بکھر گیا۔

آذر شفیق
(کراچی)

میری آمنی

میری نانی جان جنہیں ہم سب بہن بھائی پیار سے آمنی کہتے تھے۔ وہ بہت جلد ہم سب کو روتا ہوا چھوڑ کر چلی گئیں۔ میں جب بھی اپنے نانا ابو کے گھر الفلاح جاتا تھا تو سب سے پہلے اپنی آمنی کے کمرے میں جا کر انہیں سلام کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ جواب میں ''جیتے رہو'' کہتیں تھیں وہ ہم تمام بہن بھائیوں سے بہت محبت کرتیں تھیں۔ انہیں پتہ تھا کہ کونسا بچہ کیا چیز پسند کرتا ہے اس لیے وہ جب امریکہ سے آتیں تھیں تو ہر بچہ کو اس کی پسند کا کھلونا دیتیں تھیں۔ پھر سب کے پاس ہونے پر بھی وہ تحفہ دیتی تھیں۔ ان کے دیئے ہوئے کھلونے میرے پاس ابھی تک موجود ہیں اور انہیں دیکھ کر مجھے آمنی کی اور یاد آنے لگتی ہے۔ ہماری آمنی اور نانا ابو دونوں ہمارے گھر ساتھ آتے تھے۔ اب میں نانا ابو کو اکیلا اپنے گھر آتے ہوئے دیکھتا ہوں تو مجھے آمنی کی بہت یاد آتی ہے۔ ہم ہر عید کو اپنے نانا ابو کے گھر نماز کے فوراً بعد اپنے ڈیڈی کے ساتھ جاتے تھے تاکہ ہمیں جلدی سے عیدی مل جائے اور آمنی بھی سمجھ جاتیں تھیں۔ وہ ہمارے سلام کرنے کے بعد فوراً ہمیں عیدی کے ساتھ دعائیں بھی دیتی تھیں۔ اب ہمیں ان کی طرح دعائیں کون دے گا وہ ہماری بہت چاہنے والی آمنی تھیں۔

''آمنی مجھے آپ کی بہت یاد آتی ہے''

Faryal Roshan

(Toronto - Canada)

My Amanni', Why did you go away?

We used to be so happy, remember, when I used to teach you english? And sometimes you went for some work and used to say 'its really hard' or something like that. Remember the time when you & I used to sleep together at night. I used to kick you in the stomach. Well...that has changed I don't anymore. When I taught you english and used to give u homework. Do u remember the time when Fawwaz, Shadab, Hani & I had some kind of contest that who would massage your arms, legs & forehead better. Remember the time in Canada when Fawwaz & I used to come for lunch & you made us omelets, fries and stuff like that. Do you still remember in Canada we used to go on walks, like in evening sometime, well that was fun and all. Oh well... all I got to say is we all miss you a million and love you a lot too. You were the most kindest & caring person ever.

By Syed Fawwaz Masood Rizvi

(Toronto - Canada)

My Lovely Grandmother

I had the greatest grandmother. I always loved her and I still do. Mostly every night I used to massage her legs and she said that I massage the best. I miss her too much. When I went to Canada, I missed her a lot. So I wished that she could come here, and when she did, it was not a good day, she was really sick but not as much as she got later. I thought she will be fine in a week but it got worse, thats the time when I started getting really worried. She was only 66 and I could not imagine that she could get that sick. Baland mama and my bhaiya, Faraz bhai were helping her a lot. Baland mama is a Doctor and bhaiya was going to be a Doctor then. Overall everyone helped, but Mama and Bhaiya helped the most.The people who took care of my Amanni, I wish, they live happy lives. I am proud of Baland mama and Bhaiya. I wish Amanni is happy where she is and I know wherever she is, it's a better place than this. She is always in our hearts and we can never ever forget her.

○

رات سنسان دشت و در خاموش
چاند، تارے، شجر، حجر، خاموش

ہر طرف اک مہیب سناٹا
دل دھڑکتا تو ہے مگر خاموش

ڈھل چکی رات، بجھ گئیں شمعیں
راہ تکتی ہے چشم تر خاموش

مختصر ہو نہ ہو، شب تاریک
ہم کو جلنا ہے، تا سحر خاموش

حمایت علی شاعر

گوشۂ شاعر

گرچہ آئینہ در آئینہ ہے ہر سو رُخِ دوست
ایسا تنہائی کا عالم ہے کہ جی جانتا ہے

حمایت علی شاعر

غمِ معراج ... معراجِ غم

(اپنی رفیقۂ حیات معراج نسیم کی تدفین پر)

اے کینیڈا کی خاک ، امانت ہے تیرے پاس
میری متاعِ عشق، مری دولتِ ثبات
میری بہشت خواب، مری کائناتِ دل
میری تمام عمر، مرا حاصلِ حیات

آیا تھا میں یہاں کہ مسیحا نفس ہے تو
دنیائے معجزات تری دسترس میں ہے
اک سرزمینِ علم ہے ، مغرب کی ہر زمیں
''آبِ حیات'' آج فقط تیرے بس میں ہے

لیکن وہ زندگی، جو مری زندگی بھی تھی
اس کو بچا سکی نہ مسیحائی بھی تری
سائنس کے تمام کرشموں کے باوجود
دیکھی ہے اپنی آنکھ سے پسپائی بھی تری

میری دعائیں بھی نہ کسی کام آ سکیں
یہ اعتقاد بھی فقط اک اعتقاد تھا
در پردہ اور ہی ہے کوئی ناخدائے وقت
بخت رسا بھی میرا بہت کم سواد تھا

موت آئی اور لے گئی سب کچھ سمیٹ کر
میں دیکھتا ہی رہ گیا پتھر بنا ہوا
میرا تھا کیا قصور، جو یہ دی گئی سزا
کیوں ڈھا دیا خدا نے میرا گھر بنا ہوا

کہنے کو کو سقف و بام بھی، دیوار و در بھی ہیں
لیکن جسے مکان کہیں، وہ مکاں نہیں
ایسے میں زندگی کا تصور کروں تو کیا
اب وہ مری زمین نہیں، آسماں نہیں

تا دور اِک خلا ہے، اندھیرا نہ روشنی
ٹھہرا ہوا ہے وقت، نہ دن ہے نہ رات ہے
اِک چہرہ، غم میں ڈوبا ہوا، روبرو، خموش
اِک قبر کا نشان، متاعِ حیات ہے

میں اپنے دل کا حال بیاں کس طرح کروں
آنکھوں سے اشک، لفظ سے معنی بچھڑ گئے
سب مجھ کو دیکھیں اور میں پکرنگ کی طرف
دو گز زمیں میں میرے سبھی خواب گڑ گئے

ٹورنٹو (کینیڈا) کا ایک قبرستان

O

معراج، تیری قبر کی مٹی ہے میرے ساتھ
کیا جانے کب، کہاں میرا دل ساتھ چھوڑ دے
کیا جانے کب یہ خاک ملے میری خاک سے
کیا جانے کب یہ ٹوٹا ہوا رشتہ جوڑ دے

(مطبوعہ)

۱۔منشور (کراچی) جنوری ۲۰۰۳ء

۲۔چہارسو (راولپنڈی) جنوری۔فروری ۲۰۰۳ء

۳۔سخن ور (کراچی) جنوری ۲۰۰۳ء

۴۔پرواز (لندن) فروری ۲۰۰۳ء

۵۔کتاب نما (دہلی) فروری ۲۰۰۳ء

٦۔روزنامہ ''پاسبان'' (حیدرآباد) ۴/مارچ ۲۰۰۳ء

۷۔روزنامہ کائنات (کراچی) ۹ مارچ ۲۰۰۳ء

۸۔شام وسحر (لاہور) اپریل ۲۰۰۳ء

۲۱/ نومبر ۲۰۰۲ء

(اپنی رفیقہ حیات کی وفات پر)

۲۱ /نومبر ہے وہ تاریخ کہ جس دن
دنیائے محبت میری برباد ہوئی تھی
آباد مجھے دیکھ کے تقدیر کے ہاتھوں
مجھ پر کسی بے درد کی بیداد ہوئی تھی
دنیا کے دہکتے ہوئے دوزخ سے بچانے
مائل بہ کرم، جنت شداد ہوئی تھی

اس عمر میں اُس شخص کو چھینا گیا مجھ سے
جو مجھ میں مری روح کی مانند مکیں تھا
جو اپنا جواب آپ تھا جو اپنی مثال آپ
اس جیسا تو کوئی بھی زمانے میں نہیں تھا
میں آئینہ اُس کا تھا، وہ آئینہ تھا میرا
میرے لئے قدرت کا وہ انعام حسیں تھا

معراج، وہ اِک نام، بلندی کی علامت
جس نام نے مجھ خاک نشیں کو کیا اعلیٰ
جو شمع کی مانند فروزاں رہا مجھ میں
جس نے مجھے مایوس اندھیروں سے نکالا
اِک منزلِ بے نام کی جانب تھا رواں میں
نام اس کا رکھا اس نے محبت کا شوالہ

اے قادرِ مطلق، تجھے معلوم ہے سب کچھ
اس دہر میں کس کس طرح مر مر کے جئے ہم
اس ملکِ خدا داد میں کیا دکھ نہ اٹھائے
جو تو نے دیئے، ہم نے وہ ہنس ہنس کے سہے غم
تجھ سے بھی کبھی بھیک نہ مانگی گئی ہم سے
اونچا ہی رکھا ہم نے ترے نام کا پرچم

تو نے جو صلہ ہم کو دیا، یاد رہے گا
وہ قرب، یہ دوری، یہ کرم ہے کہ ستم ہے
میں بھی یہاں تنہا ہوں، وہ پکرنگ میں تنہا
اس کو بھی وہی غم ہے، یہاں جو مجھے غم ہے
جو اُس پہ گزرتی ہے، تجھے علم ہے اس کا
تو دیکھ رہا ہے کہ میری آنکھ بھی نم ہے

(مطبوعہ)

۱۔ادب لطیف (لاہور) مارچ ۲۰۰۳ء

۲۔الاقربا (اسلام آباد) اپریل تا جون ۲۰۰۳ء

۳۔نیرنگ خیال (راولپنڈی) مئی ۲۰۰۳ء

۴۔چہارسو (راولپنڈی) مئی تا جون ۲۰۰۳ء

زندگی کے آخری لمحات

آج تم جاں کنی کے عالم میں
سانس لیتی تھیں اک کراہ کے ساتھ
دیکھنا چاہتی تھیں ہر چہرہ
کتنی بے اختیار چاہ کے ساتھ

آنکھ کھلتی بھی تھی تو پل بھر کو
ہونٹ ہلتے، لرز کے رہ جاتے
دل میں جو بات مضطرب ہوتی
چند آنسو ڈھلک کے کہہ جاتے

جز مرے کوئی بھی نہ سن پاتا
دل سے دل تک جو بات آتی تھی
رُکتی چلتی ہر ایک سانس کے ساتھ
آس بندھتی تھی، ٹوٹ جاتی تھی

تم نے کس کرب سے گزارے تھے
زندگی کے وہ آخری لمحات
سوچتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں
کتنی بے بس ہے آدمی کی ذات

کاش یہ درد بانٹ سکتے ہم
کاش کچھ درد، میں بھی سہہ جاتا
کاش تنہا نہ میں یہاں آتا
کاش ''پکرنگ'' ہی میں رہ جاتا

تم
(معراج کے نام)

لوگ کہتے ہیں تم نہیں ہو یہاں
تم بہت دور جا چکی ہو اب
دور، اپنے خدا کے پاس کہیں
تم کہاں ہو یہاں، کہیں بھی نہیں

لوگ ناداں ہیں، کیا خبر اِن کو
جب خدا میرے دل میں رہتا ہے
تم بھلا کیوں وہاں نہیں ہو گی
کیسے مانوں، یہاں نہیں ہو گی

میری نزدیک، میرے گرد و پیش
میرے خوابوں، میرے تصور میں
میرے دل میں، مری نگاہوں میں
میرے ہونٹوں پہ، میری باہوں میں

تم خدا کی طرح ہو میرے پاس
تم، کہ میری طرح ہو میرے پاس

(مطبوعہ)
۱۔صریر (کراچی) اپریل ۲۰۰۳ء
۲۔کتاب نما (دہلی) مئی ۲۰۰۳ء
۳۔روشنائی (کراچی) اپریل تا جون ۲۰۰۳ء

گہوارہ

(ہمارے مکان کا نام)

معراج، تمہیں یاد ہے وہ گھر جسے ہم نے
برسوں میں بڑی چاہ سے تعمیر کیا تھا
پھر فخر سے بچوں کی طرف دیکھ کے اک دن
نام اس کا بڑے پیار سے ''گہوارہ'' رکھا تھا

اس گھر میں اُسی پیار سے تم اب بھی ہو آباد
جس سمت میں دیکھوں، نظر آتی ہو اُدھر تم
کمروں میں نشستہ کبھی، آنگن میں خراماں
نزدیک ہی رہتی ہو مرے آٹھ پہر، تم

جاذبے سے مخاطب، کبھی مونا سے کوئی بات
تسنیم سے، اُوجے سے بھی ہنس بول رہی ہو
روشن جو ذرا دیر سے گھر آئے تو گم سُم
مجھ کو مرے شعروں میں کبھی تول رہی ہو

گڑیا ہو کہ روبی ہو، تمہیں فکر ہے سب کی
یاد آئے شجیعہ کبھی فرحین و ثمینہ
ڈبّو کا تبسم، کبھی بلّو کی شرارت
فیری کبھی زویا کبھی سارا کبھی بینا

عینی ہو کرن ہو کہ طلال اور ثناء ہو
ساحر ہو عدیل، آذر و خرم ہو کہ فواز
ہر بچہ فدا تم پہ ہے، تم اُن پہ فدا ہو
ہمراز ہو تم اُن کی، تمہارے ہیں وہ ہمراز

مسعود و شفیق اور وسیم اور کبھی انور
تم سب کے لئے رہتی ہو ہر لمحہ دُعا گو
احسان میں دل ہے تو محمد پہ نظر ہے
آنکھوں میں ہے، نیویارک، ونی پیگ وٹورنٹو

شاداب ہو ہانی ہو کہ نیہا ہو کہ جمنا
دن رات سبھی رہتے ہیں اطراف تمہارے
لیکن وہ فراز، اپنا وہ محبوب نواسہ
سچ پوچھو تو تم زندہ رہیں جس کے سہارے

جس کے لیے تم آج اس گھر میں مکیں ہو
دیکھو مری آنکھوں سے، ہر اک سمت تمہیں ہو
دیواروں پہ آویزاں ہے تصویریں تمہاری
پکرنگ میں گھر ہے، مگر آباد یہیں ہو

اشاریہ

۱_جاوداں میر　۲_غزالاں حمایت　۳_تسنیم ہاجرہ　۴_اوج کمال　۵_روشن خیال

۶_زرافشاں سید　۷_فروزاں علی　۸_مجیبہ اقبال　۹_فرحین جمال　۱۰_ثمینہ روشن

۱۱_ذوالجمال　۱۲_بلند اقبال　۱۳_فریال　۱۴_زویا خان　۱۵_سارا بانو

۱۶_بینا مسعود　۱۷_عینی شگفتہ　۱۸_کرن الماس　۱۹_طلال روشن　۲۰_ثنا مسعود

۲۱_ساحر شفیق　۲۲_عدیل الدین　۲۳_آذر شفیق　۲۴_محمد علی الدین　۲۵_فواز مسعود

۲۶_مسعود رضوی　۲۷_شفیق الزماں　۲۸_وسیم خان　۲۹_محمد انور الدین صدیقی

۳۰_احسان علی خان　۳۱_محمد محی الدین　۳۲_محمد کا گھر　۳۳_احسان اور بلند اقبال کے گھر

۳۴_ثمینہ، روبی، مسعود، ذوالجمال، فرحین، بینا، ثنا اور فواز کے گھر　۳۵_شاداب کمال　۳۶_ہانی کمال

۳۷_نیہا کمال　۳۸_ڈیڈی کی منہ بولی بیٹی　۳۹_فراز مسعود　۴۰_قبرستان کا نام

معراج کے نام

سنو معراج، بلّو کا ابھی اِک فون آیا تھا
وہ کہتا تھا کہ اپنی ماں پہ کچھ اُس نے بھی لکھا ہے
کوئی مضمون، کچھ اشعار یا پھر کوئی افسانہ
جو اُس نے لکھ رکھا ہو گا مجھے اندازہ اُس کا ہے
وہ کہتا تھا، تمہاری یاد کو محفوظ کر دوں میں
ہر اِک تحریر، ہر تصویر، گھر میں جو بھی رکھا ہے
وہ آرائش کی سب چیزیں وہ کپڑے وہ کھلونے سب
جنہیں تم نے بہت ہی پیار سے گھر میں سجایا ہے
اِدھر جو بھی تمہاری یاد میں لکھا گیا اب تک
وہ آنسو بھی، جو سب روتی ہوئی آنکھوں سے ٹپکا ہے
تمہاری ایک اِک شے کی حفاظت چاہتا ہے وہ
تمہیں معلوم ہے، وہ تم سے کتنا پیار کرتا ہے
تمہاری آرزو تھی، ڈاکٹر بن جائے میرا لال

وہ اب ہے ڈاکٹر، لیکن بہت ہی نرم دل کا ہے
اُسے شعر و ادب سے بھی تمہاری طرح رغبت ہے
کبھی ہے فیض نظروں میں، کبھی غالب کو پڑھتا ہے
تمھیں معلوم ہے تم سے بچھڑ کر اُس پہ کیا بیتی
وہ پتھر کی طرح چپ ہے، نہ ہنستا ہے نہ روتا ہے
عجب سکتے کا عالم اِس پہ طاری ہے، مہینوں سے
مسلسل سوچتا رہتا ہے اور خاموش رہتا ہے
اب اُس کی خامشی ٹوٹی تو یہ اُس نے کہا مجھ سے
مرے ڈیڈی، یہ گھر تو میری امی نے بنایا ہے
خبر ہے آپ کو بھی، اُن کو کتنا پیار تھا ہم سے
انہوں نے اپنے گھر کا نام ہی ''گہوارہ'' رکھا ہے
یہ میری آرزو ہے، اِک کتاب ایسی مرتب ہو
جو میری ماں کی دنیا تھی، جو میری ماں کی دنیا ہے

تمہارے بعد

آج میں سو سکا نہ ساری رات
آج تم رات بھر تھیں میرے ساتھ
تم مجھے دیکھتی تھیں، میں تم کو
ہم نے آپس میں کی نہ کوئی بات
دل میں جو کچھ تھا، ہم پہ روشن تھا
کس قدر تھے عجیب وہ لمحات

خامشی گفتگو سراپا تھی
دل کی دھڑکن میں ساز بجتے رہے
دور بجتی رہی تھی شہنائی
آنکھوں آنکھوں میں خواب سجتے رہے
روح میں ہو رہی تھی بارش سی
اور بادل کہیں گرجتے رہے

ایک اِک لمحہ بیتے جیون کا
آ کے بیٹھا ہوا تھا اپنے پاس
سارا ماضی تھا اپنی آنکھوں میں
زندگی آ گئی تھی کتنی راس
کس قدر مطمئن تھے ہم دونوں
ایک لمحہ بھی ہم رہے نہ اُداس

کس کو ایسی وفا ملی ہو گی
کون خوش بخت اس قدر ہو گا
کس کو معلوم تھا اُجڑ کے بھی
اتنا آباد اپنا گھر ہو گا
ساتھ چھوٹا نہیں بچھڑ کے بھی
کس کا پیار اتنا معتبر ہو گا

تم تو جا ہی چکی ہو دنیا سے
میں بھی کچھ دن میں آنے والا ہوں
مجھ پہ جو کچھ گزر رہی ہے یہاں
تم کو سب کچھ سنانے والا ہوں
زندگی کو تو آزما ہی چکا
موت کو آزمانے والا ہوں

(مطبوعہ)

۱۔سب رس (حیدرآباد، انڈیا) مئی ۲۰۰۳ء

۲۔الاقربا (اسلام آباد) جون تا ستمبر ۲۰۰۳ء

لوگ کہتے ہیں

لوگ کہتے ہیں، حمایت وہ حمایت نہ رہا
اُس کا پہلا سا وہ اندازِ طبیعت نہ رہا
اُس کی باتوں میں جو بے نام کشش تھی، نہ رہی
اُس کے الفاظ میں وہ حسنِ لطافت نہ رہا
نہ وہ بے ساختہ فقرے، نہ وہ ہنستا چہرہ
اُس کے اندر تھا جو اِک رنگِ ظرافت، نہ رہا
کوئی موضوع ہو، کہنے کی وہ بے لاگ روش
بے نیازانہ وہ اظہار صداقت، نہ رہا
نہ وہ بے باکیِ افکار، نہ آہنگِ بلند
اپنے ماحول سے وہ طرزِ بغاوت نہ رہا

نہ وہ یارانے رہے اُس کے، نہ وہ دوستیاں
ایسا لگتا ہے اُسے شوقِ رفاقت نہ رہا
لوگ کہتے ہیں کہ وہ ہو گیا دنیا بیزار
زندگی سے تھا جو اِک جذبۂ رغبت نہ رہا

ٹھیک کہتے ہیں سبھی، بات وہ اِک دَور کی تھی
مجھ میں جو کچھ بھی تھی خوبی، وہ کسی اور کی تھی

(مطبوعہ)

۱۔ روشنائی (کراچی) اپریل تا جون ۲۰۰۳ء
۲۔ کتاب نما (دہلی) اگست ۲۰۰۳ء
نوٹ: یہ نظم ''روشنائی'' میں ''یہ سچ ہے'' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی

مرا ایوارڈ

مرے کمرے میں جو ایوارڈ رکھے ہیں
(جو اک شوکیس میں تم نے سجائے تھے)
اُنہیں کے درمیاں میں نے
تمہاری اِک حسیں تصویر بھی رکھی تھی
تم کو یاد ہے نا؟
مرا سب سے بڑا ایوارڈ تو تم تھیں
مرا سب سے بڑا اعزاز تو تم تھیں
جو مجھ کو میرے اللہ نے دیا تھا
مگر اب تم نہیں ہو
مرا ایوارڈ واپس لے لیا میرے خدا نے
مرا سب سے بڑا اعزاز مجھ سے چھن گیا ہے
مگر تصویر.....!
وہ تو میرے کمرے میں رکھی ہے

مجھے جو غم ملا ہے
وہ تو اِس تصویر کی صورت
مری آنکھوں میں، میرے دل میں بستا ہے
یہ غم میری محبت کی علامت ہے
مرا عہدِ رفاقت ہے
کوئی اِس غم کو مجھ سے چھین سکتا ہے؟
مرا سب سے بڑا ایوارڈ، یہ غم ہے
مرا سب سے بڑا اعزاز، یہ غم ہے

(مطبوعہ)

ا۔ ابلاغ (پشاور) ۲۰۰۳ء

معراج سے کچھ باتیں

آؤ معراج آؤ، کیسی ہو؟
کیا وہاں بھی، یہاں کی جیسی ہو؟
تم تو اپنوں میں گھر گئی ہو گی
کتنے سپنوں میں گھر گئی ہو گی
باوا حضرت، تمہاری امی جان
میری نانی، وہ میری دادی جان
آپا جان اور تمہارے دولھا بھائی
(اور جس نے بھی وہ حیات اپنائی)
وہ سبھی ۔ جو یہاں رہے مہمان
ہاں وہ بیٹی، وہ اپنی ننھی جان
جس کا نام ''آسمان'' رکھا تھا
کیا یقیں میں گمان رکھا تھا
کتنی جلد اُس کا اُٹھ گیا سایہ

میں اُسے دیکھ بھی نہیں پایا
میں یہاں تھا تو وہ تھی بھارت میں
دیکھو یہ بھی لکھا تھا قسمت میں
میری اماں بھی ہیں وہاں معراج
تم نے دیکھا اُنہیں کہاں معراج!
مجھ کو بھی اُن کا چہرہ یاد نہیں
بچپنا بھی رہا ہے یاد کہیں؟
میں تو بس تین سال ہی کا تھا
کب سے دنیا میں ہوں اکیلا سا
اِک بہن تھی، وہ ایک سال بڑی
وہ بھی اللہ کو ہو گئی پیاری
اب تو ابّا بھی جا چکے ہیں وہاں
اور میری وہ "دوسری اماں"
تم تو اُن کی بہت چہیتی تھیں
تم تھیں زندہ، تو وہ بھی جیتی تھیں

اب تو وہ بھی وہاں ہیں، تم بھی وہاں
اُن کی خدمت کرو بہت ہی وہاں
جتنا آرام تم اُنہیں دو گی
"میری اماں" کی بھی دُعا لو گی
"میری اماں"، تمہاری "پہلی ساس"
تم سے ہو گی بہت ہی اُن کو آس
تم بھی یہ بات دھیان میں رکھنا
اِک توازن اُڑان میں رکھنا
"ساس" وہ بھی ہیں، "ساس" یہ بھی ہیں
خاص وہ بھی ہیں، خاص یہ بھی ہیں
فرق دونوں میں کچھ نہیں رکھنا
اُن سے برتاؤ دل نشیں رکھنا
"دونوں ساسوں" کے ساتھ سارے لوگ
میرے ہوں یا کہ وہ تمہارے لوگ
سب ہی تم سے وہاں ملے ہوں گے

سب کے دل پھول سے کھلے ہوں گے
تم سے تو سب ہی پیار کرتے تھے
جان اپنی نثار کرتے تھے
کیا وہ سب منتظر تمہارے تھے؟
کچھ یہاں بھی تو اُن کے پیارے تھے
میں بھی تو اُن کو یاد کرتا ہوں
دل کو یادوں سے شاد کرتا ہوں
سب میں رہ کر بھی ہوں یہاں تنہا
ایسا ہو گا کوئی، کہاں تنہا!
کاش میرا بھی انتظار کریں
اور تم جیسا، مجھ سے پیار کریں

مبارک ہو

(معراج سے)

تمہیں مبارک، بہت مبارک
تمہارا بیٹا .....
تمہارا اُوجِ کمال .....
وہ منتوں، مُرادوں، دُعاؤں والا
وہ اپنے اللہ سے بڑی اِلتجاؤں والا
ہمارا بیٹا
اُسے بھی اللہ نے نوازا ہے
ایک بیٹے کا باپ اب وہ بھی بن گیا ہے
(اب اُس کی بھی تین بیٹیاں ہیں اور ایک بیٹا)

تمہیں وہ دن بھی ہیں یاد معراج
ہم بھی اکثر یہ سوچتے تھے
ہماری بھی تین بیٹیاں تھیں اور ایک بیٹا
ہمارا روشن خیال.....

اور ہم دعائیں کرتے تھے.....
ایک بیٹے سے اور اللہ نواز دے تو
ہم اُس سے کچھ بھی، کبھی نہ مانگیں گے زندگی بھر
(مگر یہ اُس کا کرم کہ اُس نے کچھ اور بچّوں سے بھی نوازا)

تمہیں تو معلوم ہے کہ میں بھی تھا اپنی اماّں کا ایک بیٹا
میں زندگی بھر رہا اکیلا
میں چاہتا تھا کہ میرے روشن خیال کی زندگی میں وہ دن کبھی نہ آئے
جو میری تقدیر بن گیا ہے

خدا نے میری دعائیں سن لیں
اور اپنے چھوٹے سے گھر میں اَوجِ کمال آیا
ہمارا ''گہوارہ'' جگمگایا

ہمارے روشن خیال کا بھی ہے ایک بیٹا
طلال روشن.....
ہماری یہ آرزو تھی.....
تم بھی دُعا بہ لب تھیں
اُسے بھی مل جائے ایک بھائی
دُعا تمہاری قبول کر لی مرے خدا نے
ہمارے چھوٹے سے گھر میں عارج کمال آیا
ہمارا ''گہوارہ'' جگمگایا

(تم اُس کو بھی کاش دیکھ پاتیں)
(تم اُس کو بھی کاش.....) خیر! اب تم
دعا کرو کہ یہ دونوں بھائی۔ طلال و عارج
ہمیشہ گہوارۂ محبت میں جسم و جاں کی طرح رہیں گے
ہمیشہ اِک دوسرے کا سایہ بنے رہیں گے

تصویروں سے باتیں

مرے کمرے کی دیواروں پہ تصویریں ہیں جتنی
سب تمہاری ہیں

اُنہیں میں اِک حسیں تصویر وہ بھی ہے
جو اِکاون میں تم نے انڈیا سے مجھ کو پاکستان بھیجی تھی
وہی تصویر جب تم دو برس کی ایک دلہن..... اِک بہو تھی
اور اِک بیٹی کی اماں بھی
وہی تصویر اب انلارج کر کے میں نے کمرے میں لگا دی ہے

ہماری زندگی کی یادگار
اِک گُم شدہ ساعت کا عکسِ غیر فانی
نوجوانی کا وہ اِک لمحہ
بہت ہی خوبصورت لمحہ، ساکت
جو اپنے دامنِ رنگیں میں اٹھارہ برس کی ایک لڑکی کو
خدا کی اِک امانت کی طرح محفوظ رکھے
مجھ کو ماضی کی جھلک دکھلا رہا ہے

تم تو باون میں یہاں آئی تھیں
اور اِک جھونپڑی کو اپنی قسمت جان کر رہنے لگی تھیں
کہاں سے تم کو لا کر کس جگہ میں نے بسایا تھا!
اِسے قسمت کہو یا وقت کی بے اعتنائی
رہنماؤں کی سیاست یا کہ ہجرت کی عطا
کچھ بھی کہو......
میں نے بہت ہی ظلم یہ تم پر کیا تھا

تم سے شرمندہ ہوں، ساری عمر شرمندہ رہوں گا

مرے کمرے میں اک تصویر وہ بھی ہے
کہ جس میں گاؤں کی گوری نظر آتی تھیں تم مجھ کو
میں جب بھی چھیڑتا تم کو
تو کتنے فخر سے اپنا دوپٹہ سر پہ لے کر
اِک ادائے خاص سے تم مجھ سے کہتی تھیں
''میں اپنی اصلیت پر ہوں، مرے اندر مرا گاؤں
ابھی تک زندہ ہے، دیکھو''
اُسی دن ہم نے سوچا تھا کہ ہندوستان جائیں گے
اور اپنے گاؤں کو دوبارہ دیکھیں گے
تمہارا پاسپورٹ آیا تو اُس پر بھی وہی تصویر چسپاں تھی
اُسی تصویر کو انلارج کر کے میں نے کمرے میں لگایا ہے
''یہ میرے گاؤں کی گوری ہے''
اُس کے فریم میں میری بھی وہ تصویر ہے

جو تم نے میرے پہلے مجموعے کی خاطر منتخب کی تھی
اُسی کو دیکھ کر، کچھ سوچ کے تم نے کہا تھا
''آگ میں پھول''
''آپ کے مجموعے کا یہ نام کیسا ہے؟''
''بہت ہی خوب! اپنے عہد، اپنی زندگی کا ترجماں ہے یہ''
مرا مجموعہ سَن چھپّن میں آیا تھا
تمھیں تو یاد ہے نا؟

اِدھر دیکھو
یہ اِک تصویر ..... تم کرسی پہ بیٹھی ہو
اُسی کو میں نے اپنے مختلف ایوارڈ
اعزازات اور تمغوں کے بیچ
اِس طرح رکھا ہے
کہ جیسے تم بھی اِک ایوارڈ ہو میرا
غلط بھی تو نہیں ہے یہ

مرا سب سے بڑا ایوارڈ تو تم تھیں
مرا سب سے بڑا اعزاز تو تم تھیں
(اِسی عنوان سے اِک نظم بھی اب میں نے لکھی ہے)
تم اِس کرسی پہ کتنی شان سے بیٹھی ہو
چہرے پر جو اِک سنجیدگی ہے، اک متانت ہے
تمہاری فتح مندی کی علامت ہے
مجھ ایسے آدمی کو تم نے اِک ''انساں'' بنایا ہے.....
یہ کچھ کم کارنامہ ہے؟
تمہاری ہی رفاقت میں مجھے سب کچھ ملا ہے
علم، عزت اور شہرت.....
اور خوشحالی
ہمارے گھر کی بوڑھی عورتیں کہتی ہیں
بچے مرد کی قسمت سے ہوتے ہیں مگر دولت.....
یہ دولت تو فقط بیوی کی قسمت سے ملا کرتی ہے شوہر کو
سو بیوی کا مقدر رنگ لایا

میں نے جو اِک فلم کے نغمے لکھے تھے، ہٹ ہوئے ایسے
کہ میں اِک ''فلمی شاعر'' بن گیا اور ریڈیو کی نوکری تج دی
بہت مقبول جب ہونے لگے نغمے
تو میں نے ڈائیلاگ اور پردۂ سیمیں کے منظر نامے بھی لکھے
میں فلمیں بھی بناتا اور ہدایت کار بھی ہوتا
کئی ایوارڈ مجھ کو مل چکے تھے
میری فلمیں بھی سُپر ہٹ تھیں
تمہیں تو یاد ہے نا؟
آج جس کرسی پہ تم بیٹھی ہوئی ہو
یہ ہماری خوش نصیبی کی علامت ہے

اب اِس تصویر کو دیکھو
جو دروازے کے اُوپر ہے
یہ ہم دونوں کی وہ تصویر ہے جب ہم بہت ہی مطمئن تھے
اور ''اپنے گھر'' میں رہتے تھے

یہ ''گہوارہ'' جو ہم نے سَن چھہتر میں بنایا تھا
ہماری محنتوں کا پھل ہے
میں نے فلمی دنیا چھوڑ دی تھی اور اپنی ''مادرِ علمی'' کے
قدموں میں (نشستہ) طالبانِ علم کی تدریس میں
مصروف رہتا تھا
اسے یوں کہیے، اپنی ذات کی تجدید، اپنے آپ کی تکمیل
میں مصروف رہتا تھا
ہماری بیٹیاں، بیٹے بھی اب تعلیم کے اعلیٰ مدارج سے گزر کر
اپنے اپنے گھر کے ہوتے جا رہے تھے
ہم نے اپنا فرض پورا کر دیا
دیکھو، ہمارے چہرے اپنے دل کا آئینہ ہیں
دیکھو تو......
تمہارے لب پہ کیسی پُر مسرّت فاتحانہ مسکراہٹ ہے

میں اب تنہا... اکیلا ہوں تو کیا

تم سے بچھڑ کر بھی تمہارے ساتھ رہتا ہوں
مرے کمرے کی دیواروں پہ تصویریں ہیں جتنی
سب تمہاری ہیں

ایک تصویر سے

تم ایک تصویر میں ہو مجھ سے خفا خفا سی
مری طرف سے نگاہ پھیرے
کچھ ایسے بیٹھی ہو جیسے مجھ سے کوئی شکایت ہے.....
میری کچھ عادتیں تو تم پر گراں گزرتی ہیں
(مجھ کو اندازہ ہو گیا ہے)
جو ہو سکے تو
بس ایک شاعر سمجھ کے مجھ کو معاف کر دو
میں تم سے شرمندہ ہوں ..... کروں کیا!
کہ ہم سے شاعر
خدا کے ناکارہ کارخانے سے ڈھل کے نکلے ہیں
کتنی کمزوریاں ہیں ہم میں.....
کسی بھی شاعر کی زندگی کو کہیں سے دیکھو
سبھی میں میرا ہی عکس تم کو دکھائی دے گا

(مگر خدا اپنے خاص بندوں پہ کچھ زیادہ ہی مہرباں ہے)
تم ایسی بیوی مجھے عطا کی
سبھی کو ایسی ہی بیویاں اُس نے دی ہیں شاید
وہ کوئی غالب ہو یا کہ اقبال
فیض ہو یا فراز کوئی
خدا نے اُس مال سے نوازا ہے
جو الگ باندھ کر رکھا تھا
جو سب سے اچھا تھا ..... سب سے پیارا

وہ آج جب کھو گیا ہے مجھ سے .....
تو اپنی قسمت کو رُو رہا ہوں
تمہیں دوبارہ تو وہ نہ بھیجے گا
(اُس کے بس میں ہی یہ نہیں ہے)
مگر وہ مجھ کو بلا تو سکتا ہے.....
مجھ کو اُس جا تو بھیج سکتا ہے

تم جہاں ہو
دُعا کرو، ہم وہاں پہ پھر ایک ساتھ رہنے لگیں ہمیشہ
یقین مانو
میں اب بہت کچھ بدل گیا ہوں

(مطبوعہ)
ا۔ سب رس (حیدر آباد دکن) آندھرا پردیش۔ انڈیا

ردِّ عمل

(معراج سے)

تمہیں خبر ہے؟
تمہارے بیٹے، تمہارے روشن خیال نے
کیا کیا ہے گھر میں؟
تمہاری اِک مسکراتی تصویر ایک دیوار پر لگا دی ہے
اور گھر کا ہر ایک منظر بدل دیا ہے
وہ گھر ..... اُداس اور خموش سا گھر
اِس اِک تبسم سے کھل اُٹھا ہے
جدھر بھی دیکھوں
ہر ایک شئے مسکرا رہی ہے
ہر ایک گوشے میں، ہر طرف جو سکوت طاری تھا
پھر سے کچھ بولنے لگا ہے
ہر ایک گلدان میں سبھی پھول

پھر سے محوِ سخن ہیں، آپس میں ہنس رہے ہیں
تمام اسٹیچو... ہر کھلونا مگن ہے اپنی شرارتوں میں
میں خود بھی ہنسنے لگا ہوں دیکھو
یہ آج کیا مجھ کو ہو گیا ہے؟
تمہاری آنکھوں میں جیسے میں بھی سمٹ گیا ہوں
میں اپنا غم بھول کر تمہاری نظر سے ہر شے کو دیکھتا ہوں
تمہاری تصویر
مسکراتی ہوئی یہ تصویر
زندگی کا پیام دینے لگی ہے مجھ کو
تمہارے ہونٹوں کا یہ تبسم
سبھی کو ہنسنا سکھا گیا ہے
خدا بھی شاید کہیں سے ہم سب کو دیکھ کر
مسکرا رہا ہے

(مطبوعہ)

ا۔ چہارسو (راولپنڈی)

فردوسِ گُم شدہ

میں تم کو ہر روز دیکھتا ہوں
تمہاری آنکھوں کو چومتا ہوں
تمہاری تصویر کے سہارے
میں اپنے ماضی میں گھومتا ہوں

وہ میرا ماضی جو حال بن کر
مری نگاہوں میں آ گیا ہے
جو لمحے لمحے میں بٹ کے میرے
نفس نفس میں سما گیا ہے

میں دیکھتا ہوں وہ رات اور میں
وہ حسنِ خوابیدہ ..... چاندنی میں
وہ سحر تھا، معجزہ تھا، کیا تھا
وہ جنت دیدہ، چاندنی میں

وہ ایک پیکر، وہ پیکر گل
جو اپنی خوشبو سے بے خبر تھا
وہ آسماں کی تھی حور کوئی
کہ چاند کوئی زمین پر تھا

تمہیں تو شاید خبر نہیں ہے
وہ رات مجھ میں ٹھہر گئی ہے
ہر ایک منظر کو ساتھ لے کر
مرے بدن میں اُتر گئی ہے

مرا بدن، جس میں ایک دل ہے
وہ دل، وہ تنہا، اُداس، ویراں
وہ دل جو تم کو قریب پا کر
بنا ہوا تھا، بہار ساماں

وہ دل وہ آئینہ جس میں تم نے
کیا تھا سنگھار زندگی کا
وہ گھر کہ جس کا ہر ایک گوشہ
تھا آئینہ دار زندگی کا

وہ گھر.. وہ فردوس.. جو زمیں پر
ہوئی تھی آباد کھو گئی ہے
وہ زندگی جو ملی تھی تم سے
وہ مجھ سے پھر دُور ہو گئی ہے

(مطبوعہ)
اےصریر(کراچی)

خطوط

(مطبوعہ ''شام و سحر'' لاہور۔ دسمبر ۲۰۰۳ء)

برادرم ڈاکٹر شبیہ الحسن صاحب

میں کچھ عرصہ پاکستان سے باہر رہا۔ امریکہ اور کینیڈا میں مشاعرے اور کانفرنسیں تو بہانہ ہوتے ہیں، اس بہانے اپنے بچوں سے ملاقات ہو جاتی ہے۔ ہم تو ''مکافات کے عمل'' سے گزر رہے ہیں۔ پچاس سال پہلے اپنے والدین کو انڈیا میں چھوڑ کر روزگار کے لئے یہاں آ گئے تھے اب ہمارے بچے روزگار کے لئے ہمیں چھوڑ کر اور بھی دور چلے گئے ہیں۔ ہمارا مقدور تو نہیں کہ جب یاد ستائے اڑ کر وہاں پہنچ جائیں۔ خدا مشاعروں کی روایت کو زندہ رکھے، ان کے طفیل ادھر چلے جاتے ہیں، بچوں سے مل آتے ہیں۔ ہمارے والدین تو اس وسیلے سے بھی محروم تھے۔ اس تمام عرصے میں صرف ایک بار آ سکے۔ ہمیں بھی مشاعرہ والوں نے بلا لیا تو ہندوستان ہو آتے اور ان کی قدم بوسی کا شرف حاصل کر لیتے۔ اب تو وہ بھی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ بھائی بہن ہیں، ان کی خاطر چلے جاتے ہیں، مگر ہماری محبتوں کے درمیان بار بار حکمرانوں کی ''سیاست'' حائل ہو جاتی ہے۔ اب پھر ''سیاسی مسائل'' الجھے ہوئے ہیں، پھر آمد و رفت بند ہے، دیکھئے کب راہیں کھلتی ہیں۔ گزشتہ تین چار سال سے انڈیا بھی نہ جا سکے... اللہ دونوں ملکوں کے حکمرانوں کو نیک توفیق دے۔

پچھلے برس میری منظوم سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' کے نام سے شائع ہوئی تھی (ماہنامہ ''افکار'' میں تقریباً پانچ سال قسط وار چھپی ہے، شاید آپ کی نظر سے بھی گزری ہو) جب کتاب چھپی، اس وقت میں یہاں نہیں تھا، کتاب اس لئے نہیں بھجوائی جا سکی کہ ہر کتاب پر ممدوح

کے نام تکریمی جملے ہوتے ہیں اور صاحب تحریر کے دستخط بھی۔ اس کے بغیر کتاب کیسے بھجوائی جاتی؟ ضخیم کتاب ہے، ساڑھے تین ہزار اشعار پر مشتمل، ڈاک خرچہ بہت زیادہ آنے لگا تو جانیوالے احباب کو زحمت دی۔ آپ اور دوسرے احباب اور مدیران رسائل کو، لاہور جانے والے مختلف شعراء اور دیگر حضرات کے ذریعے بھیجی گئیں امید ہے کہ آپ کو بھی مل گئی ہوگی، ویسے بعض اہل قلم کو دیر سویرے پہنچ ہی گئیں، مثلاً عطاء الحق قاسمی کا آج فون آیا تھا، انہیں دو تین دن پہلے کتاب ملی ہے انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا اور میں نے ''خدا کا شکر''۔ پروفیسر رعنا اقبال نے کہا تھا کہ وہ اپنا مضمون آپ کو بھیج چکی ہیں۔ اس مضمون کی ایک کاپی میرے پاس بھی تھی۔ اب میں اسے بھجوا رہا ہوں۔ مجھے حقیقت حال سے آگاہ کیجئے۔ میں یہ مضمون بذریعہ رجسٹری بھجوا رہا ہوں، اس طرح نہ پہنچنے کے امکانات کم ہو جاتے ہیں۔

''شام و سحر'' پابندی سے ملتا ہے، بہت شکر گزار ہوں، کاش میں بھی پابندی سے ''شام و سحر'' کی خدمت کر سکتا، اس کی وجہ صرف میری ''جہاں گردی'' ہے اور کچھ نہیں، کیا کروں یہ بھی مجبوری ہے، میں تو ضبط کر جاؤں، بچوں کی ماں کو کیسے ضبط کی تلقین کروں جب کہ بچے ماں کے ٹکٹ کا بندوبست بھی کر دیتے ہیں۔ وہ بیمار بھی رہنے لگی ہیں۔ انہیں اکیلے بھی چھوڑا نہیں جا سکتا، اسی کش مکش میں، میں بھی چل پڑتا ہوں کسی نہ کسی بہانے۔ خدا جانے آپ میرے اس خط سے کیا تاثر لیں۔ حقیقت حال یہی ہے۔ اچھا بھائی اجازت دیں۔ خدا حافظ

(مطبوعہ ''منشور'' کراچی۔ جنوری ۲۰۰۳ء)

بھائی ذکی صاحب

میں پچھلے دنوں جس سانحے سے گزرا ہوں آپ کو تو معلوم ہی ہے۔ اکثر احباب میرے

غم میں شریک رہے۔ میں سب کا ممنون ہوں۔ میں فرداً فرداً سب کا شکریہ تو ادا نہیں کر سکتا تھا اس لئے کینیڈا سے واپسی پر بذریعہ اخبارات سب کا شکریہ ادا کر دیا۔

آپ کی بھابھی غیر متوقع مجھ سے جدا ہوگئیں ہمارا نصف صدی کا ساتھ چھوٹ گیا۔ بچوں نے اپنی بساط سے زیادہ کوشش کی کہ انہیں بچالیں۔ امریکہ اور کینیڈا تک لے گئے کہ وہاں علاج کے امکانات زیادہ تھے۔ مگر وہی ہوا، جو خدا کو منظور تھا۔

انہیں جگر کا سرطان تھا جو یکایک نمایاں ہوا۔ یہاں ڈاکٹر شوگر کا علاج کرتے رہے اور مرض حد سے آگے نکل گیا۔ خیر، اب ہم ہیں اور ہماری تنہائی۔ عجیب بے بسی کا عالم طاری ہے۔ ان کی تدفین وہیں ٹورنٹو میں ہوئی ہے۔ جو بچے وہاں ہیں انہوں نے اصرار کیا کہ امی کو ہمارے پاس رہنے دیں۔ چنانچہ وہیں چھوڑ آیا۔ یہاں آ کر ایک نظم میں اپنا احوال یا اپنی کیفیت بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر مناسب سمجھیں تو میرے اس ''ذاتی'' غم کو بھی ''منشور'' میں محفوظ کر دیں کہ انہیں غموں سے ہم ''غم جہاں'' سے بھی آگاہ ہوتے ہیں۔

(مطبوعہ ماہنامہ ''پرواز'' لندن فروری ۲۰۰۳ء)

بھائی صابر ارشاد عثمانی صاحب

پچھلے کسی شمارے میں میرے عزیز دوست عبدالقوی ضیاؔ نے خدا جانے کیوں یہ لکھ دیا تھا کہ میرے بچوں نے مجھے کینیڈا کی شہریت دلا دی ہے۔ ایسا اب تک تو ہوا نہیں۔ انہیں یہ خبر کہاں سے مل گئی۔ یہ ضرور ہے ضیا صاحب جب سے خود کینیڈین ہوئے ہیں اپنے سبھی احباب کو کینیڈا آنے کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ کینیڈا کے شہری بن جانے میں نکتے کی بات یہ ہے کہ آپ کی اپنے وطن سے وابستگی ختم نہیں ہوتی۔ وہاں دوہری شہریت کا اصول رائج ہے بشرطیکہ آپ کا

ملک دولت مشترکہ کا رکن ہو۔

کینیڈا کو بلاشبہ ایک ''فلاحی مملکت'' کہا جا سکتا ہے۔ مفت تعلیم، مفت علاج اور بڑھاپے کا آرام، جوانی میں بے روزگاری الاؤنس اور بزرگ ہوں تو بہت سی سہولتیں وہاں حکومت فراہم کرتی ہے۔ ہائی اسکول تک نہ صرف تعلیم مفت اور لازمی بلکہ چھوٹی جماعتوں میں طلباً کا کھانا اور کتابیں اور بے شمار سہولتیں۔ غریب سے غریب آدمی اپنے بچوں کو تعلیم سے محروم نہیں رکھ سکتا۔ مزید برآں فکر ونظر، عقیدہ ومذہب کی آزادی، حکومت سیکولر ہے۔ وہ کسی مذہب کی طرف دار نہیں ہوتی۔ ہر مذہب قابل احترام اور اسے ہر طرح کا تحفظ حاصل۔ کوئی کسی کے لئے تکلیف کا باعث نہیں ہوتا۔ مسجد، مندر، گرجا سبھی مقدس ۔

ایشور، اللہ، گاڈ، خدا

ایک حقیقت، نام جدا

یہ خصوصیت پورے مغرب کی ہے، امریکہ ہو یا یورپ۔ کسی ملک میں جائیے، مذہب کے حوالے سے کسی ملک میں کوئی کوئی زیادتی نظر نہیں آئے گی۔ قانون کی پاس داری فرض، رشوت چور بازاری، ملاوٹ بے ایمانی کہیں نہیں۔ اس کے علاوہ محنت کی عزت، چھوٹا کام ہو یا بڑا، سبھی قابل احترام ہے۔ ہمارے ملکوں میں صرف برائی کی تشہیر کی جاتی ہے اس لیے لوگوں کو اصل صورت حال کی خبر نہیں ہوتی۔ ہم ویسے بھی دوسروں کی آنکھ میں تنکا دیکھ لیتے ہیں اور اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا..... لیکن پھر بھی اپنا وطن، اپنا وطن ہے۔

ہزار برائیوں کے باوجود مملکت خداداد پاکستان زندہ باد، چنانچہ میں نے بھی بچوں کے اصرار کے باوجود ابھی تک وہاں کی شہریت اختیار کرنے کا ارادہ نہیں کیا۔ آپ کو یہ اطلاع شاید مل گئی ہو کہ پچھلے دنوں میری بیگم انتقال کر گئیں۔ بچوں نے اپنی بساط سے زیادہ کوششیں کیں۔ علاج کے لئے امریکہ اور کینیڈا تک لے گئے مگر وہی ہوا جو خدا کو منظور تھا۔ بچوں کے اصرار پر ان کی

تدفین کینیڈا (ٹورنٹو) میں ہوئی اور میں یہاں ہوں۔ یہاں بھی کچھ بچے ہیں اور میرا ماضی وحال، میری کتابیں مرا سبھی کچھ یہاں ہے۔ بچوں کا اصرار ہے کہ اب وہاں آ جاؤں۔ ابھی فیصلہ نہیں کیا۔ بیگم کے سانحے پر ایک نظم لکھی تھی۔ وہی آپ کو بھیج رہا ہوں۔ آپ بھی میرے غم میں شریک ہو جائیے کہ ایک وقت زندگی میں ایسا بھی آتا ہے۔

(مطبوعہ ماہنامہ ''شام وسحر'' لاہور۔ مارچ ۲۰۰۳ء)

بھائی شبیہ الحسن صاحب

اپنے پچھلے خط میں، میں نے کچھ نجی باتیں لکھ دی تھیں۔ وہی ''مکافات'' کی باتیں۔ خدا جانے کس نے اسے کس رنگ میں لیا اور کیا تعبیر کی۔ یہاں تو ہر مسئلہ سیاسی روپ اختیار کر لیتا ہے۔ بھئی سیاست اپنی جگہ، تاریخ اپنی جگہ اور انسان کا ''دل'' اپنی جگہ۔ میں نے بھی اپنے دل کی بات لکھی تھی اور جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے۔

میں نے اس خط میں اپنی بیگم کی بیماری کا بھی ذکر کیا تھا، آخر وہ دن بھی آ گیا کہ وہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئیں۔ بچوں نے اپنی بساط سے زیادہ کوشش کی کہ کسی طرح اپنی ماں کو بچالیں، مگر مرض قابو میں نہ آیا۔ امریکہ اور کینیڈا میں علاج کی کوششوں کے باوجود، وہی ہوا جو خدا کو منظور تھا۔ یکایک ''جگر کا سرطان'' ظاہر ہوا، یہاں کے ڈاکٹر صرف شوگر کا علاج کرتے رہے اور بیماری حد سے آگے نکل گئی، آخر ۲۱/ نومبر ۲۰۰۲ء کو ٹورنٹو میں انہیں سپرد خاک کر آیا۔ جو مجھ پر گزری، میرا ہی دل جانتا ہے۔ اس دوران میرا ''دکھ'' ان اشعار میں ڈھل گیا، ایک نظم کی صورت میں، آپ کو بھیج رہا ہوں اگر مناسب سمجھیں تو اپنے موقر رسالے میں شائع کر دیجئے۔ نصف صدی کی رفاقت کے بعد یہ المیہ نصیب ہونا تھا، خیر ۔

اور کتنے ہی ایسے احباب ہیں جن کے متعلقین سے عزیزوں کی طرح ملنا جلنا تھا۔ آخری برسوں میں تو محمود سردار سے رشتہ داری بھی ہوگئی۔ ان کی دو بیٹیاں میری بہوئیں ہیں۔ میری بیگم عرصہ دراز سے شوگر کے عارضے میں مبتلا تھیں۔ کراچی میں ڈاکٹر عالمانی صاحب کے زیرِ علاج رہیں۔ کچھ عرصے بعد یکایک پتہ چلا کہ انہیں جگر کا سرطان ہے اور مرض بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ میرے ڈاکٹر بچے جو امریکہ اور کینیڈا میں ہیں، اطلاع ملتے ہی پاکستان آگئے اور اپنی والدہ کو علاج کے لئے وہاں لے گئے، میں بھی ساتھ گیا۔ بچوں نے اپنی بساط سے زیادہ کوشش کی مگر وہی ہوا جو منظور خدا تھا۔

۲۱/ نومبر ۲۰۰۲ء کو آپ کی بھابھی اس دنیا سے چلی گئیں۔ ٹورنٹو (کینیڈا) میں ہی ان کی تدفین ہوئی اور ایک ڈیڑھ ماہ بعد میں بھی یہاں آ گیا۔ یہ نظم اسی سانحے کے دوران کہی گئی تھی۔

مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو یہ نظم نہ بھجوا سکا۔ کئی رسائل میں شائع ہوئی کتاب نما (دہلی) پرواز (لندن) منشور (کراچی) تخن ور (کراچی) چہار سو (راولپنڈی) امریکہ اور کینیڈا کے اخبارات میں بھی اسی دوران چھپ گئی تھیں۔

اب جو ''پاسبان'' دیکھا تو شرمندگی بھی ہوئی ''پاسبان'' یعنی حیدرآباد سندھ کا اولین حق تھا۔ وہاں کے احباب کی نظر سے گزرتی تو سبھی احباب میرے غم میں شریک ہو جاتے لیکن میں کچھ اتنا دلبرداشتہ تھا کہ خیال ہی نہیں آیا۔ مذکورہ رسائل میں بھی اوج کمال کے سبب چھپ گئی (اسے بھی ''پاسبان'' کا خیال نہیں آیا۔ ہم دونوں بہت شرمندہ ہیں) ''پاسبان'' کی معرفت حیدرآباد کے تمام دوستوں سے میں اس کا ازالہ یوں کرسکتا ہوں کہ میں نے اس دوران اپنی رفیق زندگی کے لئے بہت کچھ لکھا ہے (ان سے متعلق کئی تحریریں بہت جلد آپ ایک کتاب کی صورت میں دیکھیں گے) ایک نظم کے چند شعر پڑھ لیجئے اور اگر مناسب سمجھیں تو دوستوں تک بھی پہنچا دیجئے۔

۲۱/ نومبر ۲۰۰۲ء

۲۱ نومبر ہے وہ تاریخ کہ جس دن

دنیائے محبت میری برباد ہوئی تھی
آباد مجھے دیکھ کے تقدیر کے ہاتھوں
مجھ پر مرے اللہ کی بیداد ہوئی تھی
دنیا کے دہکتے ہوئے دوزخ سے بچانے
مائل بہ کرم جنت شداد ہوئی تھی

چھوڑیئے ..... یہ نظم بہت تلخ ہے، غم واندوہ کے عالم میں خدا جانے کیا کچھ لکھ گیا۔ خدا مجھے معاف کرے ''پاسبان'' ایسی نظم کا متحمل نہیں ہو سکے گا کبھی وہاں آ کر دوستوں کو سنا دوں گا

ہاں..... ایک چیز یاد آ گئی کینیڈا میں میرے ایک دوست ہیں ڈاکٹر عروج اختر زیدی۔ ان کے والد ذکار پور کالج میں تاریخ کے پروفیسر تھے، پروفیسر اختر زیدی'' پرنسپل بھی رہ چکے ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ خاص طور پر ان کی تصنیف ''علی ابن ابی طالب'' (دو جلد میں) بہت مشہور ہے عروج اختر زیدی نے جون ایلیا اور آپ کی بھابھی معراج نسیم کی وفات پر قطعہ تاریخ لکھے تھے۔ وہ ابھی تک کہیں نہیں چھپے۔ آپ چاہیں تو شائع کر دیں۔ آخر میں، میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں۔

(مطبوعہ ''ابلاغ'' پشاور۔ اپریل ۲۰۰۳ء)

محترمہ سیدہ حنا صاحبہ

''ابلاغ'' کا تازہ شمارہ مل گیا۔ اس شمارے میں میرے کچھ ''ہائیکو'' ہیں۔ آپ بڑے حوصلے سے رسالہ نکال رہی ہیں، پشاور سے ادبی رسائل، پابندی سے نکل نہ سکے رفتہ رفتہ سب ہی دم توڑ گئے۔ آپ نوشہرہ میں بیٹھ کر یہ کام کر رہی ہیں۔ قابل داد ہے یہ کارنامہ۔

آپ کی کتابیں کس پبلشر نے چھاپی ہیں۔ لاہور سے جو کتابیں کراچی پہنچتی ہیں اور جن دکانوں پر فروخت ہوتی ہیں، ان میں مجھے کہیں نظر نہیں آتیں۔

(یہ ویسی ہی بات ہے جیسے ہماری کتابیں لاہور کے کسی بک اسٹال پر نظر نہیں آتیں)

مجھے نہیں معلوم کہ صوبہ سرحد کے ساتھ مجموعی طور پر یہ برتاؤ ہوتا ہے یا صرف صوبہ سندھ کے ساتھ.... یہاں کے پبلشر بھی اپنی کتابیں ملک بھر میں نہیں پھیلاتے۔ (کوئی لین دین کی مجبوری ہوگی) میں نے دیکھا ہے اور آپ نے بھی محسوس کیا ہوگا کہ کراچی اور پشاور کے اکثر اہل قلم کی کتابیں خود اہل قلم ہی چھاپتے ہیں اور اخبارات اور رسائل یا دوسرے اہل قلم تک پہنچا دیتے ہیں۔ وہ پبلشر حضرات جو باضابطہ یہ کاروبار کرتے ہیں، کم ہی ان کی طرف توجہ دیتے ہیں۔

پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا۔ ہندوستان بھر کی کتابیں لاہور سے چھپتی تھیں اور سارے ہندوستان میں پھیل جاتی تھیں۔ لاہور اشاعتی کاروبار میں مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ دہلی، لکھنو، بھوپال، بمبئی اور حیدرآباد دکن کی حیثیت ثانوی تھی۔ یہی حال رسائل کا تھا۔ ہندوستان میں تو اردو سمٹتی جارہی ہے۔ ہندی کی انگلی پکڑ کر چل رہی ہے مگر پاکستان کی تو یہ "قومی زبان" ہے۔ لاکھ سرکاری اور تعلیمی زبان نہ ہو لیکن آج نہیں تو کل ہو جائے گی۔ آخر کب تک گریز کیا جائے گا۔

اردو کو "پورے پاکستان کی سرکاری زبان" بننا چاہیے اور ہر صوبے میں وہاں کی "مقامی زبان" کو بھی اس کے ہم رکاب رکھنا چاہیے تاکہ کسی علاقائی زبان کی حق تلفی نہ ہو۔ خوش اتفاقی سے (گجراتی کے سوا) پاکستان کی ساری زبانوں کا رسم الخط ملتا جلتا ہے یعنی خط نستعلیق یا خط نسخ ہے آپ اپنی بساط بھر یہ کام کر رہی ہیں۔ "ابلاغ" کی معنویت کا بھی یہی تقاضہ ہے اس شمارے میں سندھی کہانی کا ترجمہ بھی ہے میر تقی میر کی غزل..... انگریزی میں بھی پڑھی۔

۲۰۰۱ء میں میری ایک منظوم خودنوشت سوانح حیات بھی کتابی صورت میں چھپی تھی۔ تقریباً ساڑھے تین ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ ماہنامہ "افکار" میں پانچ سال مسلسل قسط وار چھپتی

رہی۔ ممکن ہے آپ کی نظر سے گزری ہو۔ اردو شاعری میں پہلا تجربہ ہے۔ پہلا تجربہ اس معنی میں کہ یہ کتاب اپنی آپ بیتی کی معرفت اپنے ملک کی تاریخ بھی ہے۔ اکثر مسائل کا تجزیہ بھی ہے جو ہماری زندگیوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ مختصر الفاظ میں۔

آپ بیتی ہے یہ اک بکھرے ہوئے انسان کی
''آئینہ در آئینہ'' تاریخ پاکستان کی

اچھا محترمہ یہ تو ہوئیں مشترکہ مسائل کی باتیں۔ اب اپنی بات کروں، اپنے دکھ میں آپ کو شریک کروں۔ شاید کسی اخبار یا مشترکہ دوست کی معرفت آپ تک یہ خبر پہنچی ہو کہ دو تین ماہ پہلے میں ایک بڑے سانحے سے گزرا ہوں۔ میری رفیق حیات بچھڑ گئیں۔ نصف صدی کا ساتھ چھوٹ گیا۔ آپ کی بھابی میرے لئے کیا تھیں۔ آپ کو میری سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' پڑھ کر اندازہ ہوگا۔ آج میں جو کچھ ہوں اس خاتون کے سبب ہوں۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے۔ آج کل دوسرے ایڈیشن کی تیاری میں مصروف ہوں، جلد ہی آپ کو بھیجوں گا۔

ادارہ ''ابلاغ'' آپ کے غم میں برابر کا شریک ہے اور آپ کی بیگم کی وفات پر دلی رنج وغم کا اظہار کرتا ہے۔ خدا مرحومہ کو جوار رحمت میں جگہ دے اور آپ کو اس جاں گسل صدمے کو برداشت کرنے کا حوصلہ عطا فرمائے۔ (سیدہ حنا)

(مطبوعہ ''سب رس'' حیدرآباد۔ آندھرا پردیش۔ مئی ۲۰۰۳ء)

ڈیر مغنی تبسم

تم کو یہ تو معلوم ہو ہی گیا ہوگا کہ معراج نسیم، میری بیگم۔ تمہاری بھابی تین مہینے ہوئے

رخصت ہوگئیں۔ انہیں یکا یک جگر کا سرطان لاحق ہوا۔ وہ شوگر کی مریض تو تھیں ہی، علاج اور پرہیز جاری تھا۔ جگر کا سرطان کب سے تھا معلوم نہ ہوسکا، جب ظاہر ہوا تو بات بہت دور جا چکی تھی

میرا ڈاکٹر بیٹا جو کینیڈا میں ہے اور ایک ڈاکٹر بیٹی جو امریکہ میں ہے، فوری آگئے۔ ماں کو علاج کے لئے پہلے امریکہ لے گئے۔ کچھ دن ہسپتال میں رکھنے کے بعد شاید مایوس ہو گئے۔ مجھے کچھ نہ بتایا، میری ڈھارس بندھاتے رہے۔ پھر ٹورنٹو (کینیڈا) گئے وہاں میرے اور بھی بچے ہیں۔ ایک اور بیٹی ایک اور بیٹا اور ایک بہو بھی وہیں ہیں۔ ان کے بچے بھی ہیں۔ ایک طرح سے میرا آدھا گھر وہیں ہے۔ کچھ دن معراج وہاں زیر علاج رہیں اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ ۲۱/ نومبر ۲۰۰۲ء کو رخصت ہوگئیں۔ میں وہیں تھا تدفین بھی وہیں "پکرنگ" کے قبرستان میں ہوئی میں دو ڈھائی ماہ وہاں رہا، پھر پاکستان آ گیا کچھ بچے یہاں بھی ہیں نا۔ مجھ پر جو کچھ گزر رہی ہوگی تمہیں اندازہ ہوسکتا ہے۔ تم بھی تو اس قیامت سے گزر رہے ہو۔

تم حیدرآباد میں معراج سے غالباً ملے بھی تھے۔ تم عزیز قیسی، قمر ساحری اور دوسرے دوست ..... تم لوگ تو اس وقت غالباً شادی شدہ نہیں تھے۔ اس معاملے میں، میں نے سب سے پہلے قدم اٹھایا تھا وہیں مغل پورے میں ۱۴/ فروری ۱۹۴۹ کو ہماری شادی ہوئی تھی، اس وقت یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ یہ "ویلن ٹائن ڈے" ہے محبت کرنے والوں کا دن.....

وہ بلاشبہ محبت کے قابل خاتون تھیں، اس نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔ ہر دور، ہر دکھ، سکھ میں ہنستی مسکراتی رہی۔ ہم نے زندگی میں بہت برے دن بھی گزارے اور بہت اچھے بھی۔ وہ ایک بہترین رفیق حیات ثابت ہوئی۔ ہمارے آٹھ بچے ہیں، چار لڑکے، چار لڑکیاں سب کو اعلیٰ تعلیم دلائی۔ خود مجھے بھی (میں نے بھی یہیں آ کر اعلیٰ تعلیم پائی) سب بچوں کی شادیاں کردیں۔ سب اپنے گھر کے ہو گئے۔ میرے لئے کوئی کام ادھورا نہ چھوڑا۔ مجھے شاعری کرنے دی۔ میں اپنے کاموں میں مشغول رہا اور وہ اپنے کاموں میں۔ زندگی کے فرائض اسی نے پورے کیے اور

مجھے بھی سرخروئی عطا کی۔ میں اس کا بہت احسان مند ہوں۔

اس کے انتقال کے بعد میں ابھی تک ''امی کے ساتھ ہوں'' کئی نظمیں لکھ چکا ہوں، ایک نظم ''کتاب نما'' دہلی کے فروری ۲۰۰۳ء کے شمارے میں بھی چھپی تھی ایک اور بھیجی ہے۔ کچھ نظمیں یہاں چہارسو (راولپنڈی)، ادب لطیف (لاہور)، سخن ور (کراچی) اور پرواز (لندن) میں بھی چھپ چکی ہیں ایک نظم تمہیں ''سب رس'' کے لیے بھیج رہا ہوں۔ مختلف لمحوں کے احساسات ہیں۔ انہیں محفوظ کر دینا۔ تم نے میری منظوم سوانح حیات ''آئینہ در آئینہ'' بھی پڑھی ہو گی۔ تمہارے لیے اور انور معظم کے لئے راشد آزر کے ذریعے کینیڈا سے بھجوائی تھی۔ ان دنوں علی احمد فاطمی بھی وہاں آئے ہوئے تھے، اسے بھی دی اور شمس الرحمٰن فاروقی کو بھی بھیجی۔ فاروقی نے بہت تعریف کی۔ اس کے تاثرات یہاں ایک کتاب ''بارشِ سنگ سے بارشِ گل تک'' (مرتبہ پروفیسر رعنا اقبال) میں شائع ہوئے ہیں ''آئینہ در آئینہ'' کے خلاف بھی (دوران تحریر) بہت لکھا گیا تھا۔ اس میں یہاں کے بعض سیاسی مسائل بھی تو زیر بحث آئے ہیں نا۔ ایک سال تک جو کچھ اردو اور انگریزی رسائل واخبارات میں چھپا۔ رعنا صاحبہ نے سبھی شامل کر دیا ہے۔ اس دوران مجھے حکومت پاکستان کی طرف سے ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' بھی دیا گیا۔ یہ پاکستان کا صدارتی ایوارڈ ہے۔ خیر یہ کتاب اس نے تمہیں بھی بھجوائی ہے کسی صاحب کے ذریعے۔ جلد ہی مل جائے گی۔ یہ خاتون اردو یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ کئی ایم اے ہیں اور کراچی یونیورسٹی سے مجھ پر ڈاکٹریٹ بھی کر رہی ہیں۔ ان کی ایک کتاب (امریکہ کی شاعرہ) رشیدہ عیاں کی شاعری اور شخصیت پر بھی آئی ہے اور ابھی ''سدا بہار صدا'' کے نام سے احمد رشدی پر بھی ان کی مرتب کردہ ایک ضخیم کتاب شائع ہوئی ہے۔

انہیں کا ایک مضمون جگر صاحب کے بارے میں تمہیں بھیج رہا ہوں تمہیں پسند آئے گا۔ ''سب رس'' میں چھاپ دیں۔ میں نے تعارف کرادیا ہے آئندہ وہ خود آپ سے مخاطب ہوا کریں

گی اچھا یار۔ دوستوں کو سلام کہنا

تمہارا یار تنہا اور اداس

حمایت علی شاعر

(مطبوعہ ''چہار سو'' راولپنڈی۔ مئی تا جون ۲۰۰۳ء)

بھائی گلزار جاوید صاحب

''چہار سو'' کا تازہ شمارہ ملا۔ آپ بھی مرے غم میں شریک ہیں شکر گزار ہوں۔ آپ نے تو میری منظوم سوانح حیات '' آئینہ در آئینہ'' پڑھی ہے۔ اپنی بھابھی سے پہلے ہی متعارف ہو گئے ہیں (اتفاق سے ایسا موقع کبھی نہ آیا ہم سب ''گھر کے افراد'' کی طرح ملتے۔ کاش میں آپ کی خوشیوں میں شریک ہو پاتا۔ جن بچوں کی شادیاں ہوئی ہیں ان کے لیے ہزاروں دعائیں زبان پر ہیں) مجھ پر ابھی تک ''سکوت'' کا عالم طاری ہے کچھ اور نظمیں بھی لکھی ہیں۔ کہاں تک آپ کو افسردہ کروں، کچھ اور رسائل کو بھیج دی ہیں۔

آپ کی بھابھی افسانہ نگار تھیں۔ حیدر آباد دکن میں ایک ہفتہ وار رسالے ''پرواز'' کے صفحۂ خواتین کی انچارج بھی رہیں۔ یہ بات ۱۹۵۰ء کی ہے تب سے ۵۶ء تک ان کی کئی کہانیاں ہندوستان اور پاکستان کے مختلف رسائل میں چھپتی رہیں پھر ان ''کہانیوں'' کی جگہ ''حقیقتوں'' نے لے لیں۔ وہ بچوں کی پرورش میں مصروف ہو گئیں۔ کبھی کبھار کچھ لکھا بھی تو ادھورا چھوڑ دیا مگر بچوں کی زندگی کو ''تکمیل'' تک پہنچا دیا۔ سب کو اعلیٰ تعلیم دلا دی، سب کی شادیاں کر دیں۔ اب صرف میری ''تکمیل'' باقی تھی کہ قدرت آڑے آ گئی۔ ''قسمت'' نے ہمیں جدا کر دیا۔ خیر، یہ بھی خدا کا کرم ہے کہ میرے لئے کوئی ذمہ داری نہ چھوڑی۔ اب میں انہیں کی خواہش پر اپنے آپ کو سمیٹ رہا ہوں، بکھری ہوئی تحریریں یکجا کر رہا ہوں ان سے وعدہ کیا تھا۔ سب کو کتابی شکل میں چھپوا دوں گا

یہی ان کی سب سے بڑی خوشی تھی ۔ یہ خوشی مجھے زندگی بھر نصیب رہی کہ میں لکھتا رہا اور میری ذمہ داریاں وہ سنبھالتی رہیں ۔ دوست ہو تو ایسا ہو ۔ وہ میری دوست بھی تھیں، میری ہم خیال بھی تھیں مگر جو بات مجھے نہ سوجھی ، میرے بچوں اور خاص طور سے سب سے چھوٹے بیٹے بلند اقبال کو سوجھی ۔ وہ ڈاکٹر ہے اور ''اپنے انداز میں'' کبھی کبھی کچھ لکھ بھی لیتا ہے ۔ اسے شاعر یا ادیب ہونے کا دعویٰ نہیں ۔ بس ماں باپ کی روایت کا پاس کیے رہتا ہے ۔ اپنی والدہ کے انتقال کے بعد جو بھی اس پر گزری لکھتا رہا ۔ کینیڈا میں رہتا ہے ۔ وہیں اس کی والدہ کی تدفین ہوئی ہے (وہاں مقیم سارے بچوں کی یہی خواہش تھی ۔ چنانچہ یہاں کے بچوں نے ''ایثار'' سے کام لیا ۔ یہاں بڑے بچے ہیں اور وہاں چھوٹے ۔ وہ بہت دور چلے گئے تھے اس لیے اپنی ماں کو قریب کر لیا ۔ میں بھی جاتا آتا رہوں گا ۔

ہم تو ''تقسیم'' کے عمل سے گزر رہے ہیں ۔ اب یہی ان کا بھی مقدر ہوگا ۔ لیجیے میں بھی کیا باتیں لے بیٹھا ۔ کہنا یہ چاہتا تھا کہ بلند اقبال نے مجھے یہ احساس دلایا ہے کہ امی کی شخصیت بھی محفوظ کر دی جائے ۔ ان کی تحریریں ان کے خطوط ، ان کی تصاویر ان کی زندگی کے جتنے پہلو نمایاں ہیں ، وہ ایک کتاب کی صورت میں آ جائیں تا کہ خاندان میں ان کی مثال ، دوسروں کی ''رہنما'' بن جائے ۔ پاکستان میں ہمارے گھرانے کا ''نشانِ فخر'' (اس کے الفاظ میں) ''ہماری امی جان'' تھیں ۔ (شاید) کتاب کا بھی یہی نام ہوگا ۔ آج کل میں اسی کام میں مصروف ہوں ۔ دعا کیجیے کہ جو کام آپ کی بھابھی کی زندگی میں پورا نہ ہو سکا اب پورا ہو جائے ۔

(مطبوعہ سہ ماہی ''الاقربا'' اسلام آباد، جولائی تا ستمبر ۲۰۰۳ء)

برادرم منصور عاقل صاحب

شرمندہ ہوں کہ بہت دنوں بعد مخاطب ہو رہا ہوں اس دوران میں آپ کا ایک خط بھی

ملا۔ مگر میں ہی اپنی جگہ نہیں تھا کبھی کراچی سے باہر رہا اور کبھی۔ کراچی ہی میں۔
طبیعت اچاٹ رہنے لگی تھی۔ اب دوستوں کے اصرار پر دو ایک محفلوں میں شریک ہوا ہوں۔ پچھلے دنوں ایک شام میرے ساتھ منائی گئی۔ پھر چند دوستوں نے میرے فلمی نغمات خدا جانے کہاں کہاں سے جمع کر کے ایک کتاب کی صورت شائع کر دیئے۔ ''مجھ کو معلوم نہیں'' (آپ کو بھیج رہا ہوں) اس تقریب میں شرکت کی۔ بیشتر خوش گلوفن کاروں نے میرے مقبول فلمی نغمات گا کر سنائے۔ رات گئے تک محفل جمی رہی۔ کتاب بھی ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ ایک رات میں ڈھائی سو کتابیں بک گئیں۔ میرے نغمات کے سی ڈی بھی بہت فروخت ہوئے۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ میرے فلمی نغمات کتنے مقبول ہیں حالانکہ وہ فلمیں اب سے تیس چالیس سال پہلے بنی تھیں۔ فلم انڈسٹری چھوڑے بھی مجھے ۲۵ یا ۳۰ سال ہو چکے ہیں۔

(مطبوعہ ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی۔ اگست ۲۰۰۲ء)

برادرم شاہد علی خاں صاحب

''کتاب نما'' پابندی سے ملتا ہے۔ بہت شکر گزار ہوں۔ اب راستے بھی کھلنے والے ہیں بس سروس تو شروع ہو گئی ہے۔ انشاء اللہ جہاز اور ٹرین بھی چلنے لگیں گی۔ خدا کرے اب دونوں ملک محبت بھی کرنے لگیں۔ کشمیر کا مسئلہ بھی محبت کے ساتھ طے ہو جائے تو اچھا ہو۔ عوام بھی اب جنگ نہیں چاہتے۔
یہاں کل سے ''فراق سیمنار'' شروع ہوا ہے۔ تین دن جاری رہے گا ہندوستان سے بھی احباب آنے والے تھے مگر ہوئی سروس اور ٹرین نہ چلنے کی وجہ سے کوئی نہ آسکا۔ خیر اب امکانات پیدا ہو چلے ہیں۔ اگلے ماہ ایک انڈو پاک مشاعرہ ہے۔ اس میں کچھ شعراء آرہے ہیں۔

اسی طرح ہمیں بھی اپنے عزیزوں اور دوستوں سے ملنے کا موقع مل جائے گا آپ کی بھابھی کے انتقال کے بعد سے میں بالکل اکیلا ہو کر رہ گیا ہوں ۔ بچے اس تنہائی کو دور نہیں کر سکتے جو میرا نصیب ہوگئی ہے۔ خدا سب کو سلامت رکھے۔ شریک حیات کی رفاقت ہی اور ہوتی ہے۔

ایک نظم بھیج رہا ہوں "لوگ کہتے ہیں" آج کل جو عالم ہے اسی کی ترجمان یہ نظم ہے۔

جاوداں کے نام ایک خط

۹/ ستمبر ۲۰۰۳ء

جاوداں بیٹی .... تم سلامت رہو ہزار برس

تم نے اپنی امی کے بارے میں کتاب مرتب کرنے کا جو پروگرام بنایا ہے۔ وہ ہمارے خاندان میں تمہارا ایک یادگار کارنامہ ہوگا۔ بلند اقبال کی تحریک اور تم بہن بھائیوں کوششیں ... انشاءاللہ تم سب دین میں بھی سرخرو ہوں گے اور دنیا میں بھی ......

ماں... خدا کی سب سے بڑی نعمت ہوتی ہے۔ میں تو اپنی ماں سے بچپن ہی میں محروم ہوگیا تھا مگر خدا کا شکر ہے کہ مجھے جو دوسری ماں ملیں وہ بھی سگی ماں سے کم نہیں تھیں۔ تم نے تو انہیں دیکھا ہے، ہندوستان جا کر ان سے ملیں اور ان کی کچھ ماہ خدمت بھی کی ۔ اُوج کمال اور ثریا (زرافشاں) بھی ان کی خدمت کی سعادت حاصل کر چکے ہیں۔ میرے سب بھائی بہن مجھے اور تم سب کو کتنا چاہتے ہیں۔ یہ بے پناہ محبت انہیں کے واسطے سے ہمیں ملی ہے۔

جب سے آپ کی امی بیمار ہوئیں اور پھر اس دنیا سے گئیں میرے بھائی بہن کا ہندوستان میں جو حال ہے، سب جانتے ہیں ۔ عنایت کا حال تو بہت ہی غیر تھا۔ مجھے اپنے دوستوں اور سسرالی رشتہ داروں سے بھی اپنے گھر کا حال معلوم ہوتا رہا ہے ۔ پاکستان اور ہندوستان میں آمد و رفت بند ہے ورنہ یہ بچے دونوں ملکوں کو 'گھر آنگن' بنا دیتے ، کیا کریں

ہمارے سیاست دانوں کو عقل ہی نہیں آتی ۔ ہندوستان کے بیس کروڑ مسلمان اور پاکستان کے ۱۴ کروڑ مسلمان ایک دوسرے کے لئے تڑپتے ہیں ۔ اس کے علاوہ بنگلہ دیش کے ۱۶ کروڑ مسلمان بھی ''ہزاروں میل'' دور ہو گئے ہیں ۔ سب ایک دوسرے کے لئے ''غیر'' بن گئے ہیں مگر صدیوں کے خونی، تہذیبی، تاریخی رشتے کہیں فاصلوں سے ختم ہو سکتے ہیں ۔ محبتیں تو دلوں میں ہمیشہ بیقرار رہیں گی ۔ ''سیاست'' لاکھ نفرتیں پیدا کرے ۔

لاحول ولاقوۃ ..... میں بھی کیا موضوع لے کر بیٹھ گیا ۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ تم ایک غیر معمولی کام کر رہی ہو ۔ تم نے اپنے عزیز و اقربا خاندان کے سبھی افراد، سبھی بچوں اور بڑوں کے تاثرات جمع کیے ہیں ..... مجھے خوشی ہوئی ۔ تمہاری ماں ہمارے خاندان میں ایک ''مثالی خاتون'' تھیں ....

آج وہ مجھے شدت سے یاد آ رہی ہیں ۔ ہم دونوں نے مل کر یہاں دوبارہ زندگی شروع کی تھی ۔ بس ہم دو تھے ..... اور خدا کی یہ مملکت پاکستان ۔ آج جو کچھ تم دیکھ رہی ہو یہ سب تمہاری امی کی محنت اور محبت کا ثمر ہے ۔ ہر گھر میں ''ماں'' کا یہی کردار ہوتا ہے اور خوش نصیب ہیں وہ گھرانے جہاں ایسی مائیں ہوتی ہیں ۔

تمہاری ماں کتنی ہر دلعزیز تھیں ان کی بیماری کے دوران اور ان کے انتقال کے بعد مجھے محسوس ہوا ۔ دنیا کے کس خطے سے مجھے دوستوں نے فون نہیں کیے ۔ تعزیت کے خطوط نہیں بھیجے ۔ کینیڈا میں جب تک رہا فون آتے رہے ۔ کچھ دوستوں نے تو نیویارک اور شکاگو سے آ کر تمہاری امی کی نماز جنازہ میں شرکت کی ۔ کتنے لوگوں کو میں نے بہ اصرار منع کیا کہ بس وہیں سے دعائے مغفرت کر دیں ۔ عزیز الحسن کا ٹکٹ تو زبردستی واپس کرایا ۔ مظفر الدین فاروقی آخر اپنی بیگم (بھابھی بلقیس) کے ساتھ آ ہی گئے ۔

نیویارک اور نیوجرسی سے حنیف اخگر، یٰسین زبیری، زرین، وکیل انصاری، فرح، نعیمہ

سلطانہ، فرحت زاہد، عرفان دانش، صبیحہ صبا، رشیدہ عیاں، رخسانہ سحر، مسرور جاوید، عظیم میاں، ڈاکٹر جان، ڈاکٹر شفیق اوران سب کی بیگمات ..... آپ کی امی کے غم میں آنسوؤں سے شریک رہیں لاس اینجلس میں عبدالرحمٰن صدیقی، نیر جہاں، ذہانت بھائی، سلطانہ مہر، ظفر عباس (فارغ بخاری بیٹے) انور خواجہ بھی دوستوں نے تعزیتی فون کیے۔ شکاگو تو دوسرا حیدرآباد (دکن) ہے۔ وہاں سے کس کس نے میری ڈھارس نہیں بندھائی۔ میری بہن اعجاز نسرین، نسیم سرور، نیاز گلبرگوی، ڈاکٹر عذرا، ڈاکٹر نیر عزیز مسعودی، عزیز قیسی کے بھائی احمد خاں، عابداللہ غازی، صبیحہ اسد، حسن چشتی، اعجاز ہاشمی، شگفتہ اعجاز، خلیل الزماں، نسیمہ کلثوم، تمہارے نعیم چچا، رضیہ فصیح احمد (کتنے ہی نام ہیں جو اس وقت مجھے یاد نہیں آرہے ہیں) ٹورنٹو میں میری نواسیاں اور پوتا پوتی (دونوں گھروں میں) ڈائریوں میں ہر فون کرنے والے کا نام لکھ لیا کرتے تھے۔ وہ ڈائریاں میں یہاں نہ لاسکا۔ واشنگٹن سے ڈاکٹر عطیہ، زاہد بابر، مونا شہاب، اظہار کاظمی، ادا جعفری۔ کولمبس سے فرحانہ جوہی سنسناٹی سے شاہدہ نسیم سالک، ڈیٹرائیٹ سے منیب الرحمٰن، انجم تاج، عدیل زیدی۔ ہوسٹن سے ظفر تقوی، سلمان جلالی، جاوید زیدی، نیر خالد (تمہاری دوست) پرویز جعفری، عشرت آفریں، ڈیلس سے ڈاکٹر پنہاں، قسیم بھائی، سرور عالم راز اور کینیڈا کے بے شمار دوست محترم شان الحق حقی تقی عابدی، احسان بے نظیر، نسیم سید، سید افتخار حیدر، سلطان جمیل نسیم، رحیم انجان، اطہر رضوی، مشہود بے نظیر، کرامت غوری، خلیل یوسف، جاوید ہاشمی، ضامن جعفری، شاہد ہاشمی اور کئی احباب نماز جنازہ اور سوئم کی فاتحہ میں بھی شریک رہے۔ ہر شہر میں قرآن خوانی ہوئی۔ لندن سے بانو ارشد، عمران الارشد، ساقی فاروقی اور کتنے ہی دوستوں کے تعزیتی فون آئے۔ انڈیا سے تو بھی عزیزوں اور دوستوں نے فون کیے۔ اس طرح پاکستان کے مختلف شہروں سے بھی دوستوں نے میرا حوصلہ بڑھایا۔ کس کس کے نام لکھوں۔ صفحے کے صفحے بھر جائیں گے اور نام ختم نہ ہوں گے۔ میں سب کا شکر گزار ہوں، مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا ہے کہ لوگ مجھے کتنا چاہتے ہیں اور آپ کی امی ان

کی بیگمات میں کتنی مقبول تھیں۔ان کی شخصیت کے اس رخ کا مجھے اندازہ ہی نہیں تھا۔عرصہ ہوا وہ لکھنا بھی چھوڑ چکی تھیں، بچوں میں ایسی مصروف ہوئیں کہ بس ایک ''ہاؤس وائف'' ہوکر رہ گئیں تھیں مگر وہ ہمارے ادب اور ہماری ادبی سرگرمیوں سے بہت باخبر رہتی تھیں۔کتابیں اور رسائل تو ہمیشہ ہی پڑھتی تھیں۔ ہر وہ رسالہ جو گھر میں آتا، ان کی نظر سے گزرتا اور تازہ ترکتابیں بھی زیر مطالعہ رہتیں۔قرۃ العین حیدر کی تو وہ شیدائی تھیں۔

تم نے ایک مثالی کام کا بیڑا اٹھایا ہے۔خدا تمہیں کامیاب کرے،اس کا اجر دے اور تم سب کو خوش رکھے۔

تمہارا ڈیڈی

حمایت علی شاعر

گوشهٔ معراج

عنایت علی

معراج نسیم

خاندانی نام معراج النساء بیگم ہے۔ ادبی نام معراج نسیم
والدہ کا نام مولوی عبدالغفور تعلقہ بھوکردن ضلع اورنگ آباد میں پیدا ہوئیں۔ سال پیدائش ۱۹۳۳ء
ہے۔ ادیب فاضل تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۴ فروری ۱۹۴۹ء کو حمایت علی شاعر سے شادی ہوئی۔

ابتدا میں بچوں کے لئے کہانیاں لکھیں جو بچوں کے ماہنامہ ''تارے'' حیدرآباد میں شائع ہوئیں جسے مسلم ضیائی ایڈٹ کیا کرتے تھے۔ ہفت روزہ ''پرواز'' حیدرآباد کے صفحہ خواتین کی انچارج رہیں اسی دوران ریڈیو کے لئے افسانے اور فیچرز بھی لکھے۔ پاکستان ہجرت کر جانے کے بعد چند برسوں تک پابندی سے لکھا۔ سہ ماہی رسالہ ''شعور'' حیدرآباد کی معاون مدیر بھی رہیں۔
بعد میں گھر اور بچوں کی تعلیمی ذمہ داریوں کے باعث لکھنا کم کر دیا۔

عمرہ کی سعادت حاصل کر چکی ہیں۔ انگلینڈ، امریکہ اور کینیڈا بھی جا چکی ہیں کراچی میں مقیم ہیں۔

ماخوذ

''مٹی مرے دیار کی''

(مرہٹواڑہ کے اردو افسانے کی ایک انتھالوجی)

مرتب ○ میر عنایت علی

مطبوعہ، مارچ ۲۰۰۱ء، المصطفین، اورنگ آباد (دکن) مہاراشٹرا، انڈیا

پروفیسر جاوداں میر

چند باتیں

میرے چچا، میر عنایت علی، میرے ڈیڈی کے چھوٹے بھائی ہیں۔ وہ ہماری دوسری دادی کے سب سے بڑے بیٹے ہیں اور ڈیڈی سے تقریباً پندرہ سال چھوٹے ہیں۔ انہوں نے اورنگ آباد انجینئرنگ یونیورسٹی سے بی ای کیا اور بحیثیت ڈویژنل انجینئر اورنگ آباد (مہاراشٹر) ریٹائر ہوئے، سروس کے دوران ہی وہ انگریزی اور اردو میں مضامین لکھتے رہے، ریٹائرمنٹ کے بعد اورنگ آباد میں ''المصنفین'' کی بنیاد ڈالی اور مختلف کتابیں مرتب کیں۔ ''مٹی مرے دیار کی'' مرہٹواڑہ کے اردو افسانوں کی ایک انتھالوجی ہے جس میں (سابق ریاست) حیدرآباد دکن کے صوبے ''مرہٹواڑہ'' کے تقریباً سو سال کے منتخب افسانہ نگاروں کا احوال اور ان کا ایک ایک نمائندہ افسانہ شامل کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ڈیڈی کے ابتدائی دور ۱۹۴۸ء کا لکھا ہوا افسانہ ''بدلتے زاویے'' مطبوعہ ہفتہ وار ''شاہد'' (بمبئی) اور میرے تایا قاضی شفیع کا ایک افسانہ ''نقطے سے خط تک'' (مطبوعہ ''افکار'' کراچی، اپریل ۱۹۵۴ء) بھی شامل ہے۔

اپنے چچا کی عرفیت کے حوالے سے ہم انہیں ''شبیر چچا'' کہتے ہیں۔ انہوں نے مشہور شاعر سکندر علی وجد پر بھی ایک کتاب ''بیادِ وجد'' کے نام سے مرتب کی ہے۔ امی جان نے افسانہ ''خالی میز'' پاکستان آنے کے بعد لکھا تھا جو مشہور محقق اور شاعر تحسین سروری صاحب کے رسالے تجلی (کراچی) کے شمارے فروری ۱۹۵۶ء میں شائع ہوا تھا۔ امی کا ایک اور افسانہ ''ٹوٹتے جالے'' بھی میں نے اس کتاب میں منتخب کیا ہے جو ''پرواز'' (حیدرآباد دکن) میں یکم جنوری ۱۹۵۱ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا جس کے ایڈیٹر، ڈیڈی کے بچپن کے دوست، ممتاز اختر صاحب تھے۔

(ممتاز احمد خاں۔ جن کا حال ہی میں لاہور میں انتقال ہوا ہے) وہ بڑے بے باک صحافی تھے۔ ڈیڈی کی لائبریری میں ''پرواز'' کے ہفتہ وار ایڈیشن (اخبار جہاں، سائز) کی ایک فائل ہے جس میں ۹/ نومبر ۱۹۵۰ء سے ۲۹/ جنوری ۱۹۵۱ء تک کے شمارے محفوظ ہیں۔ ان شماروں میں مجھے ڈیڈی کی کچھ نایاب نظمیں اور کچھ کالم نما مضامین بھی ملے ہیں جن میں ایک ''میں امن چاہتا ہوں'' (مطبوعہ ۱۸/ نومبر ۱۹۵۰ء) اور دوسرا ''باپو کے نام'' (مطبوعہ ۵/ دسمبر ۱۹۵۰ء) کے علاوہ مشہور ادیب قاضی عبدالغفار کے جانشین روز نامہ ''پیام'' کے ایڈیٹر ترقی پسند صحافی، غالب کے فارسی کلام کے مترجم اور کیفی اعظمی کے ہم زلف محترم اختر حسن کی شخصیت پر بھی ایک مضمون ہے (مطبوعہ ۱۹/ دسمبر ۱۹۵۰ء)

''پرواز'' کے صفحہ خواتین کی انچارج میری امی معراج نسیم تھیں۔ جس کا عنوان علامہ اقبال کا یہ مصرعہ تھا ''وجودِ زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ''۔ اس عنوان کے تحت خواتین کے مسائل پر مختلف اہل قلم کے بے باک مضامین اور جرأت مندانہ مباحث شائع ہوتے تھے۔ امی مختلف سوالوں کے جوابات بھی دیتی تھیں۔ یہ صفحہ قارئین میں بے حد مقبول تھا۔ اس کے علاوہ امی جان بچوں کا صفحہ بھی ایڈیٹ کرتی تھیں جس کا عنوان تھا ''چھوٹا سا سنسار ہمارا'' (ان مخصوص صفحات کے عکس کتاب میں شامل ہیں)

''پرواز'' کے علاوہ مسلم ضیائی صاحب (جنہیں ہم پیار سے مسلم بھائی کہتے تھے) کے پندرہ روزہ رسالے ''تارے'' میں بھی ہماری امی جان بچوں کے لیے کہانیاں اور مضامین لکھتی تھیں۔ ایک مضمون ''تارے'' کے اس شمارے سے بھی کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔ جو امی کی شادی کے پندرہ دن بعد یکم / مارچ ۱۹۴۹ء کو شائع ہوا تھا۔

معراج نسیم

خالی میز

(افسانہ)

ایک ایسی کھولی جس میں ایک آدمی رہ سکے، محبوب نے کرائے پر لے رکھی تھی۔ کھولی میں ایک ٹوٹی ہوئی کھاٹ پڑی تھی جس کے ہزاروں بان دزمین پر پڑے مغفرت کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ اسی کھاٹ پر محبوب ایک طویل عرصہ سے اپنی راتیں گذار رہا تھا۔ کھولی کے سامنے سڑک کے اس پار بڑی بڑی کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں جن پر دیسی اور ولائتی دولت غنچوں کی طرح کھل رہی تھی۔ محبوب نے کھولی کے اندر ایک کونے سے دوسرے کونے میں ایک ڈوری باندھ رکھی تھی۔ جس پر وہ میلے کپڑے لٹکا دیا کرتا تھا۔

چار بجے جب وہ اپنا کام ختم کر کے واپس آتا تو تھک کر کھاٹ پر پڑا رہتا۔ صبح کوئی آٹھ بجے گھر سے نکلتا اور اسٹیشن چلا جاتا۔ وہاں اس کا کام اپنی نگرانی میں انجن میں کوئلہ بھروانا تھا۔ جس سے اس کا نہ صرف چہرہ بلکہ کپڑے بھی کالے ہو جاتے، ویسے اس کا رنگ بھی کالا ہی تھا۔ مگر ستواں لمبی ناک، پھیلے ہوئے گول دائروں میں بڑی بڑی گول آنکھیں اور کتابی چہرہ صرف یہ کہہ رہا تھا کہ اے پروردگار تو مجھے ہندوستان میں پیدا کر رہا ہے تو رنگ بھی کالا عطا کر۔

جب وہ اندھیری کھولی میں پہنچا، اور کھاٹ کی پٹی پر بیٹھے ہوئے کھولی کی اس کھڑکی میں جو دروازے متصل لگی ہوئی تھی، آئینہ رکھے شیو بنانے کی ضرورت محسوس کرتا تو شیو سے پہلے اپنے چہرے کو اس انداز سے دیکھتا گویا وہ اسے نہ صرف پسند ہے بلکہ وہ اس سے محبت کرتا ہے اور

جب وہ سامنے والی کوٹھی کی طرف دیکھتا جہاں عموماً ایک خوش پوش لڑکی بالکنی میں کھڑی خاموش سڑک کی اس انتہا کو دیکھتی نظر آتی جہاں آسمان اس سے سرگوشیاں کرتے ہوئے گلے ملتا ہے تو بے اختیار کوئی گیت گنگنانے لگتا ہے۔ اس وقت محبوب گنگناتے ہوئے کھولی کے دروازے میں آجاتا ہے اور چوکھٹ سے پیٹھ لگائے سگریٹ پیتا ہوا انکھیوں سے اس کی طرف دیکھتا رہتا۔

اس وقت اس کے دماغ کی عجیب حالت ہوتی ہے اَن گنت پھول اور کلیاں اونچی اونچی کوٹھیوں سے اتر کر اس کی نگاہوں میں رقص کرنے لگتیں۔ وہ ان کلیوں میں اسے ایک کو اپنے پاس بلا لیتا اور پھر وہ کلی نسترن کی پنکھڑیوں کا سا فراک پہنے کلائی پر ننھی سی گھڑی باندھے اپنے سنہری بالوں کو لہراتی ہوئی اس کے پاس چلی آتی ہے لیکن اس سے پہلے محبوب اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے وہ یکایک وہ وہاں سے غائب ہو جاتی ہے اور بالکنی میں کھڑی ہو کر خاموش سڑک کا نظارہ کرنے لگتی، محبوب اسے چپ چاپ دیکھتا رہتا حتیٰ کہ شام کی سیاہی اس کے تخیلات کی دنیا میں در آتی اور بالکنی میں اڑتے ہوئے رنگ مدھم پڑتے پڑتے اندھیرے میں ڈوب جاتے۔

محبوب روزانہ اپنے مقررہ وقت پر کھولی آجاتا اور اس کے بعد عموماً اس کا وقت اسی چوکھٹ پر بیٹھے بیٹھے کٹ جاتا، کبھی اگر اسے چند منٹ کی بھی دیر ہو جاتی تو اس کی ساری کہانی دھڑکن اور بے چینی کی نذر ہو جاتی اور پھر خواہ مخواہ اس کا سارا وقت اپنی خود ساختہ الجھنوں میں صرف ہو جاتا۔

آج راستہ بھر وہ سوچتا رہا کہ آج وہ ضرور کوئی فیصلہ کن اقدام کرے گا۔ اسے اپنا لے گا یا اس سے قطعی بے نیاز ہو جائے گا۔ یہی سوچ کر وہ اپنے راستے سے گذر رہا تھا کہ پھر اسے خیال آیا وہ بھی کتنا احمق ہے۔ آخر روزانہ وہ بالکنی پر کیوں آتی ہے؟ کیوں اس طرح خاموش سڑک کو تکتی رہتی ہے؟ یہ محبوب کو دیکھنے کا ایک بہانہ نہیں؟ یہ خیال آتے ہی وہ زیر لب ہنس پڑا اور ایک ہی لمحے میں اس کے سارے بھٹکے ہوئے خیالات ہوا ہو گئے۔

''عورت آخر عورت ہے''

اس نے دل ہی دل میں کہا، وہ پہل کس طرح کر سکتی ہے اسے یقیناً مجھ سے لگاؤ ہے۔ اس کی خاموشی اور افسردگی اس کی گواہ ہے۔ اس کے روزانہ بالکنی پر آ جانے کا مطلب یہی ہے کہ وہ مجھے چاہتی ہے اور محبوب نے ایک گہری سانس لی۔

اب وہ اپنی کھولی کے قریب تھا اس نے فوراً بالکنی کی طرف نگاہ کی۔ لڑکی کھڑی تھی اور محبوب نے دیکھا کہ وہ اس کی طرف دیکھ رہی ہے لیکن جونہی نگاہ ڈالی لڑکی نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ محبوب سمجھا وہ شرما گئی ہے اور وہ نہایت ہی خوش خوش زیر لب ہنستے اور سیٹی بجاتے ہوئے اپنی کھولی میں گھس گیا۔

کھولی میں پہنچ کر اس نے ہاتھ منہ دھویا، کپڑے بدلے اور بالوں میں کنگھا کرتے ہوئے اپنی کھڑکی میں سے بالکنی کی طرف دیکھنے لگا۔ لڑکی اس وقت بالکنی میں نہیں تھی۔ محبوب بڑی بے چینی سے انتظار کرنے لگا۔ کبھی کھولی کے باہر جاتا، کبھی اندر ہی ٹہلنے لگتا لیکن اس کی نگاہیں بالکنی پر جمی رہتیں۔ آج اس کا دل عجیب عجیب سی باتیں سوچ رہا تھا۔

آخر یہ لڑکیاں ایسی کیوں ہوتی ہیں۔ ہماری طرح یہ بھی عقل رکھتی ہیں، بلکہ سچ پوچھو تو کچھ ہم سے زیادہ ہی، لیکن کسی اور موضوع پر ان سے گفتگو کی جائے تو ایسی باتیں کریں گی کہ عقل دنگ رہ جائے۔ مگر جہاں سے ذرا سی محبت کی بات چھڑ جائے تو بس اسی سے بے نیاز ہو جائیں گی جیسے کچھ جانتی ہی نہیں، ہونہہ۔

یہی سوچتے ہوئے محبوب کی نگاہ ایک بار پھر بالکنی کی طرف اٹھ گئی۔ لڑکی ایک سفید فراک پہنے اپنے دونوں ہاتھ جنگلے کی منڈیر پر رکھے خاموش کھڑی تھی۔ اس کی گوری گوری کلائیوں میں سنہری جالدار چوڑیاں کس قدر خوبصورت دکھائی دے رہی تھیں۔

لیکن آج نہ جانے کیوں اس کا چہرہ غیر معمولی اترا ہوا تھا، لباس کی نفاست بھی محبوب

کی نگاہوں کو فریب نہ دے سکی ۔ اسے گمان بھی نہ تھا کہ ان اونچے مکانوں میں بھی کوئی غم پل سکتا ہے ۔ یہ پھول سا چہرہ بھی کبھی خزاں کا سوگ منا سکتا ہے؟ اور وہ سوچتا رہا آخر اسے کس بات کی تکلیف ہے۔ محبوب اپنے آپ کو اس سے الگ نہیں سمجھتا تھا وہ اسے بھی اپنی ذات میں ضم کر چکا تھا آج تو اس نے بال نہیں جمائے

اور یہ سفید فراک۔ محبوب کو سفید رنگ بالکل پسند نہیں تھا۔ کسی سفید چیز کو دیکھتے ہی اس کے دل میں بیوگی کا خیال آجاتا تھا، وہ سوچنے لگا۔

شام اس قدر حسین ہے اور وہ آزردہ، ایسا معلوم ہوتا ہے، ڈوبتے سورج کی کرنوں نے چلتے چلتے اس کے چہرے کی سرخی چوس لی ہے۔ محبوب نے یہ بات اپنی زبان سے نہیں کہی، لیکن اس کی نگاہوں کے انداز سے یہی ظاہر ہو رہا تھا۔ وہ کچھ عجیب نظروں سے پھیلتی ہوئی شفق کو دیکھ رہا تھا۔ ایک بار پھر اس کی نگاہ بالکنی پر پڑی اور اس کا جی بے اختیار چاہا کہ کسی طرح وہاں پہنچ جائے۔ اسے جھنجھوڑے اُس سے پوچھے کہ وہ سوکھی ڈالی بنی ہوئی کیوں کھڑی ہے۔ اسی دوران میں محبوب نے ایک سگریٹ جلائی اور پان کھانے کے لئے پاس والی گلی میں مڑا، پان منہ میں رکھے، سگریٹ کا دھواں اڑاتا ہوا پھر کھولی کی طرف آگیا۔ اب جو اس نے بالکنی کی طرف نظر اٹھائی تو اس نے دیکھا کہ وہ اکیلی نہ تھی بلکہ ایک خوش پوش نوجوان اسے اپنے بازوؤں میں لئے کھڑا تھا۔ محبوب نے جمع شدہ پیک کی ایک بڑی سی کلی کی اور غور سے دیکھنے لگا۔ وہ آسمانی رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھا، اس کے بال لہری اور گھنگریالے تھے لیکن اس کا سرخ چہرہ کچھ اس قدر پھٹا پھٹا تھا کہ متواتر اس کی طرف دیکھتے ہوئے محبوب کو گھن سی آگئی۔

اس نے پھر ایک پیک تھوکی اور ختم ہوتے ہی سگریٹ کو پھینک کر دوسری سگریٹ جلائی وہ بہت ہی خاموشی سے پارسن لڑکی کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی خاموشی کا سبب تلاش کر رہا تھا، لیکن محبوب نے دیکھا کہ سورج کے غروب ہونے تک دونوں بالکنی میں خاموش کھڑے کسی چیز کو دیکھ

رہے تھے اور اندھیرا بڑھنے لگا، سڑکوں کے قمقمے جل گئے۔ محبوب وہیں کھڑا رہا اور وہ دونوں سائے سایوں کی طرح سیاہی میں گھلتے گھلتے رات کے اندھیرے میں تحلیل ہو گئے۔ محبوب کچھ دیر چپ چاپ وہیں کھڑا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا بجلی کے کھمبے کے پاس آگیا اور سگریٹ جلائی اور کھمبے سے ٹیک لگا کر بڑا کش لیکر دھویں کے بادل فضاء میں چھوڑ دیئے۔

''کون ہے یہ''

''اونہہ ہوگا کوئی''

''اس کا شوہر؟''

''ہوسکتا ہے''

'پھر اب تک کہاں تھا'

'کہیں باہر گیا ہوگا'

'لیکن اس سے ملکر اسے خوشی تو ہونی چاہیے''

''ہاں، وہ چپ چاپ کیوں رہی''

''ہوسکتا ہے اس سے اسے نفرت ہو''

''نفرت''

''اور کیا تم نے اس کی شکل بھی دیکھی ہے''

''ارے کچھ یہی سلسلہ ہے ورنہ روزانہ وہ تمہیں کیوں دیکھتی تھی''

''مجھے''

اور محبوب کے سارے جسم میں پھر ایک بار جھری جھری سی دوڑ گئی۔ کچھ عجیب شش و پنج کے عالم میں اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر بالکنی پر نظر دوڑائیں۔ بالکنی میں اندھیرا تھا محبوب نے اس اندھیرے کو بہت کھنگالنے کی کوشش کی۔ مگر اس کی نظر کوئی سراغ نہ پا سکی۔ یکا یک محبوب کو یاد

آیا، کچھ عرصہ پہلے وہ اسی طرح اداس اسی جگہ پر کھڑا تھا، اس زمانے میں اسے اپنی غریبی کا شدید احساس ہو چلا تھا۔ اسے اس کھولی میں آئے کچھ ہی دن ہوئے تھے اور اس سامنے کی کوٹھیوں کی رنگا رنگ بزم آرائیاں اس کے دل کو مسلسل کچوکے لگا رہی تھیں۔ وہ اپنی کھولی میں رہتا تھا لیکن اسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کھولی میں نہیں رہتا بلکہ کھولی اس پر رکھ دی گئی ہے۔ کھولی اس کے واسطے نہیں ہے بلکہ وہ اس گندی کھولی کے واسطے ہے۔ اسی طرح کے خیالات نے اس کے سارے وجود کو دوزخ کی طرح دہکا دیا تھا اور اس کی کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیا کرے ایک دن ان ہی خیالوں میں گم وہ بجلی کے کھمبے سے ٹیکا لگائے کھڑا تھا کہ یہی پارسن لڑکی کہیں سے آ گئی، رات کچھ اتنی ہی گہری تھی، محبوب کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی محبوب بھی کچھ چونک سا گیا تھا اور کچھ ہی لمحوں کے سکوت کے بعد اس نے محسوس کیا کہ پارسن لڑکی اس سے قریب آ گئی ہے اور اس سے کہہ رہی

''جی'' محبوب کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔

''آپ، یہیں رہتے ہیں نا''

''جی ہاں'' محبوب کے گلے میں آواز رندھ گئی۔

''میں نے اکثر آپ کو دیکھا ہے''

''جی'' اور محبوب نے محسوس کیا جیسے اس کی زبان باقی الفاظ ادا کرنے سے قاصر ہے

''ادھر گلی میں اندھیرا ہے .... اور مجھے کچھ ضروری کام ہے۔ نکڑ کے گل فروش سے کچھ پھول منگوانے ہیں''

محبوب کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے وہ فوراً اس طرف مڑا اور چلتے ہوئے کہہ دیا کہ ''میں لے آتا ہوں''

لڑکی محبوب کے آنے تک وہیں کھڑی رہی اور جب محبوب پھول لے کر لوٹا تو اس نے ہنس کر محبوب کا شکریہ ادا کیا اور ان پھولوں کی قیمت پوچھی۔

محبوب کے ہونٹوں پر کچھ عجیب سی لعاب آمیز ہنسی پھیل گئی

''جی اس کی کیا ضرورت ہے''

لڑکی نے پھر سے پیسے لینے کو کہا اور جب دوسری بار بھی محبوب اسی طرح ہنس پڑا تو وہ بھی ہنسنے لگی اور پھر وہ لڑکی چلی گئی لیکن محبوب؟ وہ بڑی دیر اس کے قدم گنتا رہا۔

اور آج بھی محبوب اس کھمبے کے سہارے کھڑا سوچ رہا تھا، اس دن کے بعد سے محبوب نے اسے کبھی ہنستے ہوئے نہیں دیکھا، حتیٰ کہ آج بھی جب وہ اکیلی نہیں تھی اور ان خیالات نے محبوب کے دل میں پھر چراغاں کر دیا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر سینکڑوں جھلملاتے تارے اسے دیکھ کر ہنس رہے تھے۔

محبوب کے شب و روز اپنے مرکز کے گرد گھومنے لگے۔ اس کے تصورات کی دنیا پھر آباد ہوگئی۔ ہر شام جب وہ اسٹیشن سے لوٹتا تو وہ پارسن لڑکی اس کے ساتھ ہوتی اور ہر صبح جب وہ اسٹیشن جانے لگتا تو وہ ہنستے ہوئے خدا حافظ کہتی، اسی طرح دو ایک ہفتے گذر گئے۔ ہر شام بالکنی پر رنگ نکھرتے رہے اور اندھیروں میں تحلیل ہوتے رہے اور محبوب سوچتا رہا۔ کس طرح اس سے ملاقات کی صورت نکالی جائے۔

وہ نوجوان جسے دو ہفتے قبل محبوب نے بالکنی میں دیکھا تھا وہ دو تین دن بعد ہی غائب ہو گیا اور پارسن لڑکی اب پھر اکیلی تھی۔ محبوب سمجھ چکا تھا کہ وہ اس کا کوئی رشتہ دار ہوگا جس سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ ایک دن کھولی کی طرف واپس آتے ہوئے محبوب اس پارسن لڑکی کو راستے میں دیکھ کر چونک پڑا۔ لڑکی ہوٹل میں داخل ہو رہی تھی، محبوب نے سوچا موقع اچھا ہے۔ وہ بھی جلدی جلدی ہوٹل کی طرف جانے لگا۔ راستے میں اسے ایک ترکیب سوجھی، اس نے اس کے لئے کچھ پھول خرید لئے اور جب ہوٹل میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ وہ بیٹھی چائے پی رہی ہے۔ وہ بھی سامنے والی میز پر بیٹھ گیا اور اپنے لئے چائے منگوائی۔ محبوب چائے ختم کر چکا تو سوچنے لگا، اب کیا

کرنا چاہئے، کس طرح اسے یہ پھول دیئے جائیں۔ پھر اس کی نظر اس کی میز پر گئی۔ اب اس پارسن لڑکی کے ساتھ وہ نوجوان بھی تھا جس سے وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی، محبوب کا دماغ چکرایا، لیکن پھر اس نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔

ہوٹل ہے آخر یہاں اسے اخلاقاً ہی ہنسنا چاہیئے۔

پھر اس نے دیکھا کہ وہ نوجوان لڑکا کاؤنٹر کی طرف چلا گیا۔ محبوب کو اطمینان ہو گیا اور اٹھ کر لڑکی کی طرف جانے لگا۔ اپنی جرأت پر وہ گھبرا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ تاہم وہ اسی حالت میں اس کی میز تک پہنچا۔ میز کے قریب اس کے پاؤں ٹھٹک گئے، ابھی وہ اپنے ہاتھ آگے بڑھا بھی نہ سکا تھا کہ لڑکی نے ساتھی کو آواز دی

''ٹامس یہ کیا کہتا ہے''

نوجوان محبوب کو گھورتا ہو آگے بڑھا اور اس سے پہلے کہ کچھ کہتا، محبوب نے پھول آہستہ سے ایک خالی میز پر رکھ دیے اور سر جھکائے چپ چاپ باہر نکل آیا۔ محبوب کے چلے جانے کے بعد پارسن لڑکی دیر تک بیٹھی نوجوان سے باتیں کرتی رہی لیکن جب چلنے لگی تو اس نے آگے بڑھ کر خالی میز سے وہ پھول اٹھا لئے، نوجوان استفسار یہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا، تو ہنس کر کہنے لگی ''میں بھول گئی تھی میں نے یہ پھول اس سے منگائے تھے''

مجھے تحفہ دینے کے لئے'' نوجوان نے ہنستے ہوئے پوچھا اور اسے اپنے بازو میں لے لیا

''ہاں'' کہتے ہوئے لڑکی نے گلدستہ کا ایک پھول توڑا اور ٹامس کے کالر میں لٹکا دیا۔

(مطبوعہ ماہنامہ ''تجلی'' کراچی فروری ۱۹۵۶ء)

معراج نسیم

ٹوٹتے جالے

(افسانہ)

کسی روز بھی اس جھونپڑی میں کسی نے چراغ جلتے نہیں دیکھا۔ہاں البتہ یہ ضرور دیکھا گیا کہ ایک جوان عورت کھلتا کھلتا رنگ، لمبی پتلی ہندوستانی ناک اور گول گول آنکھیں..... اپنے دونوں بچوں کو لئے بیٹھی ہے۔ایک بچہ مٹی پتھر کھیل رہا ہے اور دوسرا اس کی گود میں نڈھال بیٹھا اونگھ رہا ہے۔وہ اکثر کچھ نہ کچھ سوچتی دکھائی دیتی، نگاہیں خلا میں گم اور ہاتھ اپنے ننھے کا سر سہلاتے ہوئے اور جب وہ اپنے ایک بچے کو گود میں لئے اور دوسرے کی انگلی پکڑے مانگنے کے لئے نکلتی تو اس وقت بھی وہ اسی طرح گم سم سی نظر آتی۔اسے یہ بھی خیال نہیں رہتا کہ کتنی نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی ہیں، کیسے کیسے فقرے چست کئے جا رہے ہیں۔کتنی مقدس داڑھیاں رال میں تر ہیں اور خدا کے یہ پیارے بزرگ اپنے ہونٹوں کی شرارت چھپانے کے داڑھیوں پر ہاتھ پھیر پھیر لے رہے ہیں۔اسے ان میں سے کسی کا احساس نہیں ہوتا۔اسے یہ بھی خبر نہ ہوتی کہ اس کی جھولی میں کچھ پڑ بھی گیا ہے۔وہ صبح سے شام تک یوں ہی سڑک سڑک گھومتی اور جب گھر لوٹتی اور ایک پھٹے پرانے میلے سے کپڑے پر اپنی جھولی جھٹکتی تو اس کے سوکھے ہوئے لبوں پر خفیف سی مسکراہٹ کھیل جاتی اور وہ اور اس کے بچے کچھ زہر مار کر لیتے۔

آزاد ہندوستان نے کیا کچھ نہیں دیا ہے اپنے عوام کو..... بھوک، افلاس، فاقہ اور بے روزگاری اور ان سب سے بڑھ کر جیل..... جس کی حسین اور پر کیف زندگی سے اس کا شوہر سرشار

تھا۔ اس کے حصہ میں بھی بہت کچھ نعمتیں آئی تھیں۔ نگاہوں کا تعاقب، فقرے، رال اور بھیک اور اس عظیم نعمت کو سنبھالے رکھنے کے لئے ایک میلی کچیلی جھولی..... یہی جھولی اس کا سرمایہ حیات تھی آزادی نے سوچ سمجھ کر ہی اس کی جھولی آزاد نہیں کی تھی، ظاہر ہے کہ اگر یہ جھولی آزاد ہو جاتی تو پھر وہ بچے کچے روٹی کے ٹکڑے کہاں جاتے جو خدا کے مقدس اور پاک نام پر بطور خیرات دیے جاتے ہیں۔ ان پاکیزہ مسکراہٹوں کا کیا ہوتا جو سونے اور چاندی سے جلا پا کر آنکھوں اور لبوں پر تیر جاتی ہیں۔ کس قدر خوش ہو جاتا ہے دل ان مناظر کو دیکھ کر ... سر بازار گھومتی اور بکتی ہوئی جوانیاں ممتا کے کندھوں پر بھوک سے نڈھال معصومیت، ہاتھوں میں لٹکتی ہوئی جھولیاں، زباں پر تڑپتی ہوئی فریادیں۔ کوئی اللہ کے نام پر پاؤ ٹکڑا

حق میں دعا کریں گے بال بچے

دے دو کچھ بھگوان کے نام پر بابا

اور وہ سوچتی کیا اسی دن کے لئے سب نے آزادی چاہی تھی؟ کیا اسی دن کے لئے اس کے شوہر نے مہینوں جیل کاٹی تھی؟ کیا اسی دن کے لئے کہ اس کا شوہر آج بھی جیل بھگت رہا ہے اور اس کی نگاہوں میں اس کے شوہر کی تصویر اتر جاتی اور وہ سوچنے لگتی۔

پتہ نہیں اس کا شوہر کس حال میں ہے، زندہ بھی ہے یا مر گیا اور یہ خیال آتے ہی اس کا انگ انگ کانپ اٹھتا اس کی آنکھوں میں بے ساختہ آنسو امڈ آتے اور وہ مسلسل روتی رہتی، مسلسل آنسو بہا چکنے کے بعد جب اس کی طبیعت کچھ ہلکان ہو جاتی تو اسے خیال آتا۔ ہو سکتا ہے اس کا شوہر زندہ ہو اور اس خیال کے آتے ہی اس کے ہونٹوں پر پھر مسکراہٹ کھیل جاتی، اسے اپنی اس حرکت سے خود ہی شرم محسوس ہوتی اور وہ بڑے ہی پیار سے اپنے پہلو میں سوئے ہوئے بچوں کو تھپکنے لگتی پھر اس کے دماغ میں ہلکے ہلکے خیالات ابھرنے لگتے اور وہ ایک عجیب سی مسرت اپنے دل میں محسوس کرتے ہوئے سوچتی۔ کاش اس کا شوہر اس سے قریب ہوتا، اس کی جھونپڑی میں

چراغ جلتے۔ اس کی لاوارث زندگی پھولوں کی مانند حسین ہوتی، اس کی یہ معصوم کلیاں اپنے باپ کی محبت کے گھنے تہمارے میں پل کر جوان ہوتیں، پھولوں کی مانند کھل پڑتیں اور پھر ان پھولوں کی گود میں اور بھی کلیاں خواب عدم سے بیدار ہوتیں اور پھر کتنی حسین ہوتی وہ زندگی۔ دھنک کی طرح حسین، چاندنی کی طرح لطیف، سحر کی طرح پاک اور اس کا خیال اپنے گھنے سیاہ بالوں کی طرف چلا جاتا۔ یہ بال تو کبھی کے سفید ہو جاتے اور اسے بے اختیار ہنسی آ جاتی ہے وہ بڑی دیر تک آپ ہی آپ ہنستی رہتی لیکن پھر آپ ہی آپ اس پر اداسی بھی چھا جاتی، اس کا ہر رنگین سپنا ٹوٹ جاتا اور وہ بڑی دیر تک اپنے شوہر کی یاد میں کھوئے رہتی۔

اس کا شوہر ہندوستان کو آزادی ملنے سے پہلے کانگریس پارٹی کا ایک سرگرم کارکن تھا اور اسی جرم میں وہ کئی بار جیل بھی جا چکا تھا لیکن اب جبکہ آزادی آ چکی تھی اس کے شوہر کو آزادی نصیب نہیں ہوئی تھی وہ آزاد رہ کر بھی غلام ہی تھا، اسے کسی دن بھی اپنی پھٹی ہوئی دھوتی کی بجائے باریک سفید دھوتی پہننے کو نہیں ملی۔ کوئی دن ایسا نہیں آیا کہ وہ اپنے گھر میں ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بے فکر بیٹھا اپنے ننھے منے بچوں کو پیار کر رہا ہو۔ کبھی آرام سے کچھ دیر سویا ہو، وہ تو جب بھی گھر آتا اپنی بیوی بچوں کو باسی کھانا کھاتے ہوئے دیکھتا، وہ دیکھتا کہ اس کی بیوی اس کے پرانے قمیض کو پیوند دے رہی ہے، کوئی کالا تو کوئی پیلا وہ دیکھتا کہ اس کے اوڑھنے کی گودڑی پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی ہے اور چارپائی کی بان ٹوٹ ٹوٹ نیچے لٹک رہی ہے وہ دیکھتا کہ اس کے معصوم بچے پیٹ میں پاؤں دیئے سو رہے ہیں، سرد ہوا کے جھونکوں سے ان کے جسم کپکپا رہے ہیں۔ وہ اپنی بیوی اور اپنے بچوں کو کبھی بھی اس حالت میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا، وہ ہندوستان کے کسی انسان کو اس حالت میں دیکھنا نہیں چاہتا تھا اور اسی لئے وہ کانگریس پارٹی کارکن بن کر آزادی کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہا تھا لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ آزادی ..... کانگریس خود اپنے لئے چاہ رہی ہے اپنے عوام کے لئے نہیں، ٹاٹا برلا کے لئے چاہ رہی تھی اس پسینے کے لئے نہیں جو برسوں سے

اس پودے کو سینچ رہا ہے، اس کے ساتھی کل بھی پسینے میں غرق تھے اور آج بھی ہیں، کل بھی وہ دن بھر محنت کر کے صرف کچھ آنے گھر لے جا سکتے تھے اور آج..... آج تو وہ بھی انہیں وقت پر نہیں ملتے اور اس کے شوہر نے یہ حقیقتیں اپنے ساتھیوں کے سامنے رکھنی شروع کیں اور ایک بار جب وہ وقت پر تنخواہ نہ ملنے کے سلسلے میں اپنے ساتھیوں کو ہڑتال کے لئے آمادہ کر رہا تھا تو مل مالک نے پولیس سے ساز باز کرا کے گرفتار کروا دیا اور اس کے بعد سے وہ آج تک لاپتہ تھا۔ اس کی بیوی سمجھ رہی تھی کہ وہ جیل میں ہے لیکن کچھ دنوں سے اسے کچھ اس قسم کی خبریں مل رہی تھیں کہ وہ جیل میں بھی نہیں ہے، پتہ نہیں وہ کہاں ہے، کہیں وہ جیل کی سختیاں جھیلتے جھیلتے مر تو نہیں گیا؟ یہ خیال اس کی بیوی کے لئے بڑا تشویش ناک تھا اور اسی لئے وہ پہلے سے زیادہ اب پریشان تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے؟ کہاں جائے؟ کس سے جا کر اپنے شوہر کی بھیک مانگے؟ اسے رفتہ رفتہ اس آزادی سے نفرت سی ہونے لگی تھی، دن دن بھر بھیک مانگنے کے باوجود اس کی جھولی خالی تھی۔ اس کے بچے بھوکے تھے، اس کا شوہر لاپتہ تھا، اس کے سارے گھر میں اندھیرا تھا، اسے آزاد ہندوستان کی ہر چیز باسی نظر آتی تھی، اسے اب بھیک مانگنا بھی دوبھر ہو گیا تھا، وہ اکثر سوچتی کب چھٹکارا ملے گا اسے اس دن رات کی ذلت سے؟ کب وہ بھکارن سے عورت بنے گی.....؟ اپنے بچوں کی ماں اپنے شوہر کی بیوی بنے گی؟ کیا وہ یوں ہی سڑک سڑک کی خاک چھانتی رہے گی اور رات بھر اپنے پھٹے پرانے ٹاٹ پر لیٹے تکیے میں اپنے آنسو دفن کرتی رہے گی۔ کبھی کبھی اس کے دماغ میں کچھ عجیب عجیب سے خیالات دوڑنے بھاگنے لگتے۔ کیا وہ اپنی زندگی سنوارنے کے لئے نیا سنسار بسائے۔ ایسا کہ جس میں دوشیزگی ہر رات دلہن بنے اور سویرا ہوتے ہی بیوہ ہو جائے ہر روز رات میں بستر پر پھول بکھریں اور سویرے ان پھولوں کی مہک کے ساتھ اس کی عصمت کا جنازہ بھی اٹھ جائے اور ان خیالات کے آتے ہی اس کے دل کی گہرائیوں سے کوئی بول اٹھتا۔ آج ایک تو ہی نہیں اس دیس کی کروڑوں مائیں، بہنیں زندگی کی اس کٹھن رہ گزر سے گزر رہی ہیں، تیرا غم

سب کے مقابلہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ ''جزو'' کو ''کل'' پر فوقیت دینا جماعتی احساس کی توہین ہے، یہ مت بھول کہ تو کسی کی بے لطف زندگی کا کیف ہے، کسی کے پژمردہ ہونٹوں کی مسکراہٹ، کسی کے بے چین دل کا سکون ہے، تجھے ان دھنک رنگ خوابوں کا احساس نہیں جو جیل کی اندھیری کوٹھری میں جاگنے والی محبت ہر رات دیکھی ہے؟ تجھے صبح فردا کے ان ہنستے کھیلتے آفتابوں کا خیال نہیں جو تیری گود میں ماتا کا امرت پی کر جوان ہونے والے ہیں؟ تجھے اپنی زندگی کی فکر ہے، مستقبل کی گود میں مسکرانے والی اس جنت کا احساس نہیں جس کی صبح تیری مسکراہٹوں میں جاگ رہی ہے؟ جس کی مہک تیرے آنچل میں بندھی ہوئی ہے، جس کے برگ وبار پر ابھر آنے والے رنگ تیری مانگ کے سندور میں مسکرا رہے ہیں..... تو''

''نہیں، نہیں..... میں ایسا نہیں کروں گی ایسا نہیں ہوگا''

وہ آپ ہی آپ بڑبڑائی جیسے وہ اپنے دل کی گہرائیوں سے اٹھنے والی خاموش آواز کا مطلب پوری طرح سمجھ گئی ہو، اس کے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہوگئیں، وہ سوچنے لگی اب اسے کیا کرنا چاہئے اور وہ بڑی دیر تک اس موضوع پر سوچتی رہی اور یکا یک اس کی آنکھوں میں چمک سی دوڑ گئی اسے یاد آیا۔

''آکاش نارائین''

آکاش مقامی سوشلسٹ پارٹی کا معتمد تھا اور شہر کے محنت کشوں کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا گزشتہ الیکشن میں اسے سب سے زیادہ ووٹ ملے تھے۔

بھکاری نے سوچا کہ اگر وہ اس سے اپنے شوہر کی بھیک مانگے تو وہ ضرور اسے چھڑا لانے کی کوشش کرے گا اور یہی سوچ کر وہ اپنے بچوں کو لے کر پڑوس کے گھر گئی اور اپنے بچوں کو وہاں چھوڑ کر آکاش سے ملنے چلی گئی۔

آکاش کا گھر شہر کے اس محلے میں تھا جہاں سونے چاندی کے بیوپاری رہتے تھے۔

ایک بہت ہی عالیشان عمارت کے صدر دروازے میں قدم رکھتے ہی یکا یک اسے احساس ہوا، اتنے بڑے محل میں رہنے والا جھونپڑی میں رہنے والی ایک بھکارن کے دل کا حال سمجھ بھی جا سکے گا؟! ابھی یہ خیال اس کے دماغ میں پوری طرح گھوم بھی نہ سکا تھا کہ ایک دوسرے خیال نے اس کی جگہ لے لی ''بھگوان بھی تو آکاش پر رہتا ہے'' اور بھگوان کے بلند مقام کا سہارا لے کر آکاش کے مکان میں داخل ہوگئی۔ سامنے ہی ایک موٹر گیارج تھا جس میں ایک بہت ہی نفیس کار کھڑی ہوئی تھی۔ موٹر گیارج کے قریب ہی سے بنگلہ پر چڑھنے کی سیڑھیاں تھی۔ بھکارن جوں جوں یہ سیڑھیاں چڑھتی گئی اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے کندھوں کا بوجھ ہلکا ہوتا جا رہا ہے اوپر پہنچ کر جوں ہی وہ سیدھے ہاتھ کی جانب پلٹی اس کی نظر سامنے کے وسیع ہال میں رک گئی۔ سامنے ہی صوفے پر ایک بھاری بھرکم جوان ململ کا نہرو شرٹ پہنے بیٹھا ہوا تھا۔ یہ آکاش تھا۔ بھکارن اسے دیکھتے ہی سہم گئی۔ اس نے ایک بار پھر اچٹتی ہوئی نظر آکاش پر ڈالی اور آکاش نے اسے دیکھ لیا۔ باہر شام اپنی سیاہ زلفیں فضا کے دوش پر پھیلائے جا رہی تھی اور اس کے مکان میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے سویرا بیدار ہو رہا ہو۔

آکاش نے بھکارن کو اندر آنے کے لئے کہا اور بھکاری اپنی ساری کا پلو ٹھیک کرتی ہوئی ڈرتے ڈرتے اندر چلی گئی یکا یک اس کا دل گھبرانے لگا۔ اس نے سوچا کہ واپس چلی جائے لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھوں میں اپنے بھوکے بچوں کی اتری ہوئی صورتیں تیر گئیں۔ کانوں میں رونے کی آوازیں مسلسل آنے لگیں شوہر کا اداس چہرہ نگاہوں میں ابھر ڈوب گیا، وہ بے چین ہوگئی اس کی آنکھوں میں بے اختیار آنسو امڈ آئے۔ آکاش اس کے قریب آ گیا۔

''کیوں..... بات کیا ہے..... کس لئے آئی ہو؟''

''میں، میں'' بھکارن ڈرتے ڈرتے کہنے لگی ''میں آپ سے اپنے شوہر کی بھیک مانگنے آئی ہوں، وہ کئی مہینوں سے جیل میں ہے لیکن سنا ہے کہ اب وہ جیل میں بھی نہیں ہے''

''میں سمجھا نہیں تمہارا مطلب''

''پچھلے مہینے سے اس کی کوئی چھٹی نہیں آئی۔ راہو کہہ رہا تھا وہ اس جیل میں نہیں ہے''

''کہیں اور چلا گیا ہوگا؟'' آکاش نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔'' آپ اسے چھڑا دیجئے۔ میں اور میرے بچے بھوکے مر رہے ہیں'''' اوہ..... اچھا میں کوشش کروں گا'' آکاش مسکرانے لگا اور اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر دو روپے کا نکالے اور اس کی طرف بڑھا دیئے۔

''یہ لو کچھ.....؟''

''بھکارن لیتے ہوئے کچھ ہچکچائی لیکن جب آکاش نے ہاتھ کچھ اور اس کی طرف بڑھا دیا تو بھکارن نے وہ روپے لے لئے اور ابھی اپنی ساری کے پلو میں باندھ ہی رہی تھی کہ اس نے محسوس کیا اس کے کندھے پر آکاش کا ہاتھ آہستہ آہستہ اپنی گرفت مضبوط کر رہا تھا'' میں تمہیں اور روپے دوں گا'' اور بھکارن نے محسوس کیا جیسے اس کا سارا جسم سرد ہو چکا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے سارے جسم میں پگھلے ہوئے انگارے سے دوڑ گئے۔ اس نے دہکتی ہوئی آنکھوں سے آکاش کی طرف دیکھا۔

آکاش ہونٹوں پر گیلی گیلی مسکراہٹ کھل رہی تھی۔ بھکارن نے جھٹکے سے اس کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹا دیا اور غصہ سے بے قابو ہو گئی اس نے جلد جلد اپنے پلو کی گرہ کھولی اور دو روپے نکال کر اس کی طرف پھینک دیئے۔

''یہ لے اپنے روپے، کمینے، آخر تو نے سمجھا کیا ہے؟''

آکاش کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ایک دم غائب ہو گئی اس نے پریشان ہو کر کہا

''مگر سنو تو اے عورت''

''عورت نہیں..... تیری ماں ..... شرم نہیں آتی اپنی ماں پر نظر ڈالتے ہوئے'' اور یہ کہتے ہوئے بھکارن دروازے کی طرف پلٹی۔ آکاش نے بڑھ کر اسے روکنا چاہا لیکن اس سے

پہلے کہ اس کے ہاتھ بھکارن کو اپنی گرفت میں لے لیتے بھکارن نے پلٹ کر اس کے منہ پر تھوک دیا اور تیزی سے دروازے سے باہر نکل آئی۔

(مطبوعہ ہفتہ وار ''پرواز'' یکم جنوری ۱۹۵۱ء حیدرآباد دکن، آندھرا پردیش۔ انڈیا)

(عکس ''پرواز'' ہفتہ وار)

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ

صفحہ خواتین

بچوں کا صفحہ

عکس خط

(انور صاحب کے نام)

[illegible]

10.12.86

انور ۔ بہت ساری دعائیں!

جناب کا خط ملا ۔ اسے بار بار پڑھ کر تم
سے حسد پیدا ہو گیا ——
یہ تو کوئی بات نہ ہوئی ۔ کہ شکر خورے کو شکر ہی
ملے ۔ پھر ہم اپنے دھندوں میں جتے ہوئے ہیں
تمام کام میں اضافہ ہی ہو رہا ہے ۔ اللہ بہتر جانتا
ہے ۔ کہ آپ کے پاس انصاف کیوں نہیں ہے ۔
آخر ہم نے تمہارا کیا ایسا بگاڑا ہے ۔ کہ مالکن
لوگوں کا کام ، جتنی سب ادھر ہی پاس ہو رہی ہے ۔
سارا آرام ادھر ۔ اور سارا کام ادھر ۔
کچھ تم ہی انصاف سے کام کرو ۔ تاکہ ہم بھی آرام کریں ۔
اگر اتنا آرام کیا تو "تھلتھل" ہو جاؤ گے ۔ اللہ سے ڈرو
اور ڈیوٹی کھڑے ہو کر انجام دو ۔

یہاں سب خیریت سے ہیں ۔ بابو میاں کی شادی ہو گئی ۔
دلہن ۔ دلہا مزے میں ہیں ۔ خاندان میں سب

''پرواز'' سے انتخاب

''آپ کا خط ملا''

بہن للتا دیوی، نمستے۔ بہن آپ نے ہم پر خوب تنقید فرمائی ہے۔ ہم نے اس کا برا نہیں مانا۔ آپ کیوں سمجھتی ہیں کہ ہم آپ کی باتوں کا برا مان جائیں گے۔ آپ نے جو کچھ ہمیں لکھا اس میں خلوص اور پیار ہے اور خلوص اور پیار کا کون برا مانتا ہے۔

ہم صحت مند زندگی کے لئے تنقید کو ناگزیر سمجھتے ہیں بشرطیکہ اس میں نیک نیتی اور وسعت نظری سے کام لیا جائے۔ آپ نے جو کچھ لکھا ہے اس میں کچھ باتیں صحیح ہیں اور کچھ غلط، صحیح باتیں ہم نے مان لیں۔ ہمیں امید ہے کہ اب آپ کو ہم سے کوئی شکایت نہیں رہے گی۔ رہیں غلط باتیں تو آپ مان جائیے۔ فقط آپ کی بہن۔

معراج نسیم

(مطبوعہ ''پرواز'' صفحۂ خواتین ۱۲، ۱۲/دسمبر ۱۹۵۰ء)

ایک تعارف

(آنسہ سعادت رضوی مدیرہ ''اقدام'')

حیدرآباد کے سب سے مقبول اور محبوب اخبار ''اقدام'' کی ہردل عزیز مدیرہ آنسہ سعادت رضوی نے یہ مضمون از راہ خلوص ''پرواز'' کو عنایت کیا ہے جسے ہم شکریے کے ساتھ شائع کر رہے ہیں۔ سعادت رضوی ہمارے یا آپ کے لیے نئی نہیں۔ وہ آج کے حیدرآباد کی ایک دلیر اور مجاہد خاتون ہیں۔ عورت کی آزادی اور حریت کی پرجوش علمبردار بہنیں اور مائیں، سعادت کو اپنی متاع عزیز سمجھتی ہیں اور وہ سب ہم آواز ہو کر ''آزادی نسواں'' کے اس مقدس جہاد میں سعادت کا ساتھ دے رہی ہیں۔ یہ طویل مضمون عورت کی آزادی اور تعلیم سے متعلق ہونہار مدیرہ کے پرخلوص جذبات اور روشن خیالات کا آئینہ دار ہے جسے بہت ہی بے لاگ اور بے باک انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

معراج نسیم

(مطبوعہ ''پرواز'' صفحۂ خواتین ۱۹/دسمبر ۱۹۵۰ء)

آدمی کے ساتھی دو جانور تھے، کتا اور گھوڑا۔ دونوں کے پاؤں کی بناوٹ ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ گھوڑے کا سم ایک لمبا ناخن ہے جو ہمارے ناخنوں کی طرح بڑھتا رہتا ہے۔ اگر گھوڑا زیادہ دن تک اصطبل میں بندھا رہے تو یہ سم یا ناخن اتنا بڑھ جائے گا کہ گھوڑا چلنے پھرنے سے معذور ہو جائے گا۔ پرانے زمانے میں گھوڑے جنگلوں میں پھرا کرتے تھے، اس وقت ایسی سڑکیں نہیں تھیں جن پر چلنے سے ان کے سم تھوڑے ہی عرصہ میں گھس جاتے۔ اس زمانہ میں گھوڑے ریتلے میدانوں یا گھاس کے قطعوں پر پھرتے رہتے تھے۔ اس وقت نہ تو سموں کے گھس جانے کا ڈر تھا اور نہ بہت زیادہ بڑے ہو جانے کا۔ قدرت کی طرف سے اس بات کا انتظام تھا کہ وہ حسب ضرورت ہی بڑھیں بھی اور حسب ضرورت گھس بھی جائیں لیکن آج کل ایسا نہیں۔ اب گھوڑے انسانوں کے ساتھ رہتے ہیں۔ اس لئے ان کی ضروریات بھی مختلف ہیں۔ چنانچہ گھوڑوں کے سم گھس جانے اور بے کار ہو جانے کے خوف سے آدمی نے ان کے لئے نعل یا جوتے بنا دئے، چنانچہ عربی میں جوتوں کے جوڑے کو نعلین (دو جوتے) کہتے ہیں اور انگریزی میں ''ہارس شو'' کے معنی ہیں ''گھوڑے کا جوتا''۔

(مطبوعہ۔ یکم/مارچ ۱۹۴۹ء)

اورنگ آباد کے اردو افسانے کی ایک انتخابی

مٹی میرے دیار کی

مرتب: عنایت علی، بی۔ای (سیول)

مکان نمبر 64-12-1 ''مونا'' محلہ گھاٹی، اورنگ آباد۔ 431001 (مہاراشٹر) انڈیا